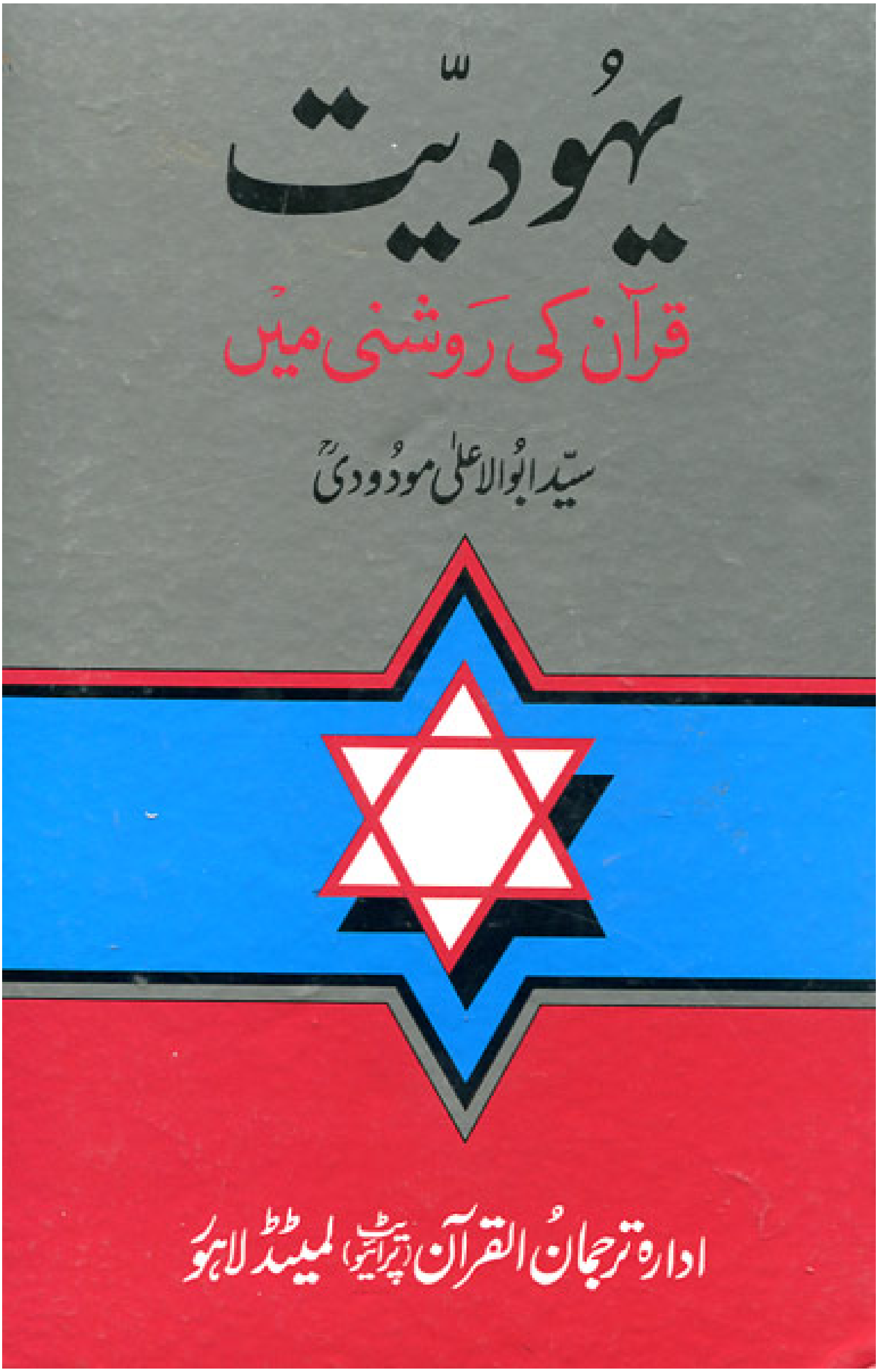

یہودیت
قرآن کی روشنی میں
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

یہودیت
قرآن کی روشنی میں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کتاب : یہودیت قرآن کی روشنی میں

تالیف : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب : نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی

ناشر : ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

مطبع : وطن عزیز پرنٹرز لاہور

اشاعت :

طبع اول		
طبع دوم :	۱۹۸۵ء	۱۱۰۰
طبع سوم :	۱۹۹۵ء	۲۰۰۰
طبع چہارم :	۲۰۰۰ء	۲۰۰۰

قیمت : / روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ
لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے
جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

(آیت ۱۲۰۔ سورۃ البقرہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ------ اور درود و سلام نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام بنی نوع انسان تک پہنچایا۔

زیر نظر کتاب "یہودیت قرآن کی روشنی میں" پہلے "یہودیت و نصرانیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جس میں "یہودیت قرآن کی روشنی میں" اور "نصرانیت قرآن کی روشنی میں" دونوں کتب ایک جلد میں یکجا تھیں۔ اب ہم نے اس کتاب کو مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی نظر ثانی کے بعد دو الگ الگ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مولانا مغفور کے حواشی کی روشنی میں کتابت کی اغلاط کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے اور معیار طباعت و کتابت پہلے سے بہتر بنا دیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ کتاب مولانا مغفور کی مختلف تحریروں کو ان کے وسیع لٹریچر میں سے یکجا کر کے ترتیب دی گئی ہے۔ تاہم اپنے موضوع پر جامع معلومات کی بنا پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے اور ان کو یہودیت کی تاریخ اور اس کے اصلی خد و خال سے واقفیت حاصل ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم و مغفور کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہمیں سیدھی راہ پر چلنے اور دین حنیف کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ناشر

سید خالد فاروق مودودی

فہرست

باب ۳

باب ۷

باب ۸

باب ۹

باب ۱۰

باب ۱

بنی اسرائیل

حضرت ابراہیمؑ سے حضرت یوسفؑ تک

تعارفی توضیحات

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلفاء مقرر کیے۔ مشرق اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔ (۱)

حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی دو شاخیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد، جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اسی لیے وہ اپنا سلسلہ نسب انہی سے جوڑتے تھے۔

دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اسی لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔ (۲)

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یامین ایک

بیوی سے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوبؑ کی جائے قیام حبرون (موجودہ الخلیل) کی وادی میں تھی جہاں حضرت اسحاقؑ اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام رہا کرتے تھے ان کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کی کچھ زمین سکم (موجودہ نابلس) میں بھی تھی۔ (۳)

بنی اسرائیل کی وجہ تسمیہ

اسرائیل کے معنی ہیں عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے تھے انہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ (۴)

اس قوم کی اپنی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت یعقوبؑ نے اللہ تعالیٰ سے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی ہوتی رہی اور صبح تک لڑکر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا اب مجھے جانے دے تو انہوں نے کہا: میں تجھے نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا یعقوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ [لہ] (۵)

بنی اسرائیل کا وسیع اور عظیم ماضی

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسفؑ کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانے کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے، اور ان ہی کا

لہ ملاحظہ ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمہ کتب مقدسہ THE HOLY SCRIPTURES شائع کردہ جیوئش پبلیکیشن سوسائٹی آف امریکا ۱۹۵۴ء، کتاب پیدائش باب ۳۲، آیات ۲۵ تا ۲۹۔ عیسائیوں کے ترجمہ بائیبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے یہودی ترجمے کے حاشیہ میں اسرائیل کے معنی لکھے گئے ہیں WHO STRIVETH WITH GOD یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے"۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں عیسائی علماء نے اسرائیل کے معنی کی تشریح یہ کی ہے کہ WRESTLOR WITH GOD یعنی "خدا سے کشتی لڑنے والا"۔ پھر بائیبل کی کتاب ہوسیع میں حضرت یعقوبؑ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کشتی لڑا۔ پھر فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب آیا۔"

(باب ۱۲۔ آیت ۴) مؤلف

سکہ مصر اور اُس کے نواح میں رواں تھا۔

عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر (المائدہ: ۲۰) پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی زمانہ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا ہے جسے خود حضرت موسےٰ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ (۶)

یہودیت کی ابتداء اور وجہ تسمیہ

اصل دین جو حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کرلی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔

اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یمین کی نسل ہی باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہود کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی بعد مسیح تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اُس میں شامل ہے اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو (اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔ ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کرلی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کے دورِ عروج میں بنی اسرائیل کی نوآبادکاری

بائیبل کے علماء کی تحقیق اگر درست مان جائے تو حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ ق م کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے قرآن میں قصۂ یوسف علیہ السلام کی ابتدا ہوئی ہے یعنی ان کا خواب دیکھنا اور پھر کنوئیں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ برس کی تھی جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے وہ بائیبل اور تلمود کی روایات کے مطابق حبرون کے شمال میں دوتن (دوتھن) کے قریب واقع تھا اور جس قافلے نے انہیں کنوئیں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر میں چرواہے بادشاہوں کا دورِ حکومت

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں: HYKSOS KINGS کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین و شام سے مصر جا کر ۲ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں سلطنت مصر پر قابض ہو گئے تھے عرب مورخین اور مفسرین قرآن نے ان کے لیے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔

مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انہیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسفؑ کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں رہا۔ اسی دور کی طرف سورہ مائدہ رکوع ۴ کے آغاز میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا "اس نے

بعد میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھی جس نے "ہکسوس" اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ ڈھائی لاکھ کی تعداد میں عمالقہ ملک سے نکال دیے گئے۔ ایک نہایت متعصب قبطی النسل خاندان برسرِ اقتدار آگیا اور اس نے عمالقہ کے زمانے کی یادگاروں کو چن چن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پر ان مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آتا ہے۔

مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کے نام سے یاد نہیں کرتا کیونکہ فرعون مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے لیکن بائیبل میں غلطی سے اس کو بھی "فرعون" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ "فراعنہ" ہی تھے۔ موجودہ زمانہ کے محققین جنہوں نے بائیبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے۔ عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرمانروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

حضرت یوسفؑ کا دورِ اقتدار

مصر کا دارالسلطنت اس زمانے میں منفس (منف) تھا۔ جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل تک فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۷-۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیزِ مصر کے گھر رہے آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔ ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرمانروا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلا شرکتِ غیرے تمام مملکتِ مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا۔ (۸)

بائیبل کا بیان

بائیبل کا بیان ہے کہ سب افرادِ خاندان جو اس موقع پر مصر گئے ۶۷ تھے۔ اس تعداد میں دوسرے گھرانوں کی ان لڑکیوں کا شمار نہیں کیا گیا جو حضرت یعقوبؑ کے ہاں بیاہی ہوئی آئی تھیں۔ اس وقت حضرت یعقوبؑ

کی عمر ۱۳۰ سال تھی اور اس کے بعد وہ مصر میں ۱۷ سال زندہ رہے۔

اس موقع پر ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسفؑ سمیت ان کی تعداد ۶۸ تھی اور تقریباً پانچ سو سال کے بعد جب وہ مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ بائیبل کی روایت ہے کہ خروج کے بعد دوسرے سال بیابانِ سینا میں حضرت موسیٰؑ نے ان کی جو مردم شماری کرائی تھی اس میں صرف قابلِ جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت، مرد، بچے سب ملا کر وہ کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔ کیا کسی حساب سے پانچ سو سال میں ۶۸ آدمیوں کی اتنی اولاد ہو سکتی ہے؟ مصر کی کل آبادی اگر اس زمانے میں ۲ کروڑ فرض کی جائے (جو یقیناً بہت مبالغہ آمیز اندازہ ہوگا) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف بنی اسرائیل وہاں ۱۰ فیصدی تھے۔ کیا ایک خاندان محض تناسل کے ذریعے اتنا بڑھ سکتا ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ۵۰۰ برس میں ایک خاندان تو اتنا نہیں بڑھ سکتا لیکن بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد تھے۔ ان کے لیڈر حضرت یوسفؑ جن کی بدولت مصر میں ان کے قدم جمے خود پیغمبر تھے۔ اس کے بعد چار پانچ صدی تک ملک کا اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس دوران میں یقیناً انہوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی۔ اہلِ مصر میں سے جو لوگ اسلام لائے ہوں گے ان کا مذہب ہی نہیں، ان کا تمدن اور طور طریق زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا۔ مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھہرایا ہوگا جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ ان کے اوپر اسرائیلی کا لفظ اسی طرح چسپاں کر دیا ہوگا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر "محمڈن" کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی روابط اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قوم پرستی کا طوفان اٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل پر ہی نہیں ہوئے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ یکساں لپیٹ میں لے لیے گئے اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا۔

ہمارے اس قیاس کی تائید بائیبل کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "خروج" میں جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے، بائیبل کا مصنف کہتا ہے کہ "ان کے ساتھ ایک ملی جلی گروہ بھی گئی" (۱۲: ۳۸) اسی طرح "گنتی" میں وہ پھر کہتا ہے کہ "جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی" (۱۱: ۴) پھر بتدریج ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے لیے "اجنبی" اور "پردیسی" کی اصطلاحیں استعمال ہونے

لگیں۔ چنانچہ تورات میں حضرت موسیٰؑ کو جو احکام دیے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے۔

"تمہارے لیے اور اس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں جیسے تم ہو۔ تمہارے لیے اور پردیسیوں کے لیے جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں ایک ہی شرع اور ایک ہی قانون ہو۔" (گنتی، ۱۵: ۱۵-۱۶)

"جو شخص بے باک ہو کر گناہ کرے خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی وہ خداوند کی اہانت کرتا ہے وہ شخص اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے گا۔" (گنتی، ۱۵: ۳۰)

"خواہ معاملہ بھائی کا ہو یا پردیسی کا، تم ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا۔"

(استثنا، ۱: ۱۶)

اب یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ کتاب الٰہی میں غیر اسرائیلیوں کے لیے وہ اصل لفظ کیا استعمال کیا گیا تھا جسے مترجموں نے "پردیسی" بنا کر رکھ دیا۔ (۹)

تلمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دارالسلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ شاہی مملکت کے بڑے بڑے امراء و اہل مناصب اور فوج فرا کو لے کر ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے۔ وہ دن وہاں جشن کا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ (۱۰)

فصل ۳

دورِ یوسفیؑ کے بعد کیا گزری

بنی اسرائیل پر فراعنہ کے مظالم

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (القصص، آیت ۴)

ترجمہ: "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"

اصل میں لفظ عَلَا فِي الْأَرْضِ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے زمین میں سر اُٹھایا، باغیانہ روش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت یعنی بندگی کے مقام سے اُٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ دھار لیا، ماتحت بن کر رہنے کے بجائے بالادست بن بیٹھا اور جبّار و متکبّر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر حقوق دیئے جائیں بلکہ اس نے تمدّن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے۔[1]

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذمی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تفرق صرف سیاسی حقوق میں ہے اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمران جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے اور ہر وہ شخص (باقی صفحہ پر)

بائبل میں اس گروہی تفریق اور امتیاز کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ ہے۔

بائبل سے ایک ضروری اقتباس

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسفؑ کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا، دیکھو بنی اسرائیل ہم سے زیادہ قوی ہو گئے ہیں۔ سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انہوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انہیں ستائیں۔ سو انہوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے..... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کرایا اور انہوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں..... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے ..... باتیں کیں اور کہا کہ جب عبرانی (یعنی اسرائیلی) عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو سپھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا، اور اگر بیٹی ہو تو جیتی رہے۔" (خروج، باب ۱۔ آیت ۸۔۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا تھا اور قبطیوں کے ہاتھ جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی تھی اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انہیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیلی کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا پھر انہیں حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقتور ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ مصر کی آبادی کے

ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا اور سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آل فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے۔ یَسُومُونَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ۔

مگر بائیبل اور قرآن دونوں اس ذکر سے خالی ہیں کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ الٹ جائے گا اور اسی خطرے کو روکنے کے لیے فرعون نے اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، یا فرعون نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی گئی تھی کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ افسانہ تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے ہمارے مفسرین نے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا، مضمون "موسیٰ"، اور ص ۲۲۳-۲۲۴)۔ (11)

بقیہ صفحہ ۲۹ سے آگے۔ اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان صوبوں کا سکہ ہو جاتے۔ آخر اس تفریق میں اور اس فرعونی تفریق میں کیا وجہ شباہت ہے جس کی بنا پر محکوم نسل کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ میں شامل نہیں ہو سکتا؟ جس میں محکوم نسل کے لوگوں کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار بنیادی انسانی حقوق تک بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی، تمام فوائد و منافع اور حسنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمران قوم میں پیدا ہو جائے۔ (مولف)۔

باب ۲

بعثت موسیٰ علیہ السّلام کے بعد

بعثتِ موسیٰؑ کے وقت بنی اسرائیل کا حالِ زار

بنی اسرائیل کئی صدیوں تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعے سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔[۱] (۱۲)

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (یونس آیت ۸۳)

ترجمہ: "(پھر دیکھو کہ) موسیٰؑ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا، اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔"

متن میں لفظ ذُرِّيَّةٌ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ "نوجوان" کیا ہے مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پُر خطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیاوی

---

[۱] بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزرا ہے قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے۔ بائیبل اور تلمود بھی اس پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتیں اور نہ مصر کی قدیم تاریخ اور آثار سے اس معاملے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (از مصنف)

تفہیمات حصہ دوم ص ۲۴۹

افراد کی بزدلی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہتی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوتے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پُر نظر آ رہا تھا بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ، ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

دعوتِ موسیٰؑ سے اکابر و اشراف کا گریز

چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوتِ اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا۔ پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام کی امت تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے لیکن ایک مدت دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو غلامی سے پیدا ہوتی تھی ان میں اتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرمانروائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھتے یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا، اس کا اندازہ بائیبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے۔

"جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستہ پر کھڑے ملے۔ تب انہوں نے ان سے کہا کہ خدا ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے۔ تم نے تو ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔"
(خروج ۶: ۲۰-۲۱)

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے:

"ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے اس کو بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے۔ بس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔"

نہی باتوں کی طرف سورہ اعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ

اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ط

(آیت : ۱۲۹) ⑬

فصل

دربارِ فرعون میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت

حضرت موسیٰؑ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ (الاعراف حاشیہ ۸۶)

سورہ طٰہٰ اور سورۂ نازعات میں فرمایا۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اور الشعراء میں فرمایا اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ "جب کہ پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا ظالم قوم کے پاس، فرعون کی قوم کے پاس۔" (۱۴)

فرعون کا ردِ عمل

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ (القصص ۔ آیت ۳۶)

"پھر جب موسیٰ ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں۔"

اشارہ ہے ان باتوں کی طرف جو تبلیغ رسالت کے سلسلے میں حضرت موسیٰؑ نے پیش کی تھیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ النازعات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى "کیا تو پاکیزہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو خشیت اختیار کرے گا" سورہ طٰہٰ میں ہے کہ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ

٭ دوسری طرف انہوں نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم و تربیت دی کہ:

"اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخری کامیابی انہی کیلئے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ (الاعراف ۔ آیت ۱۲۸) (ع ۲ ص ۱۳۲)

اتبع الھدیٰ - اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی " ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ سزا ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑ دے" اور اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ " ہم تیرے رب کے پیغمبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے"۔ انہی باتوں کے متعلق فرعون نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فرعون مصر سے اوپر بھی کوئی ایسی مقتدر ہستی ہے جو اس کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے دربار میں بھیجے اور جس سے ڈرنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے کہا جائے۔ یہ تو نرالی باتیں ہیں جو آج ہم ایک شخص کی زبان سے سن رہے ہیں۔ (۱۵)

(۲) وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ (القصص آیت۔ ۳۸)

"اور فرعون نے کہا "اے اہلِ دربار، میں اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان، ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی ہے اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ اہلِ مصر کے مذہب میں بہت سے معبودوں کی پرستش ہوتی تھی اور خود فرعون کو جس بنا پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَہٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِھَتَکَ "اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوٹ دے دے گا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔"

(الاعراف رکوع ۱۵) اس لیے لامحالہ یہاں فرعون نے لفظ "خدا" اپنے لیے بمعنی خالق و معبود نہیں بلکہ بمعنی مطاع و حاکمِ مطلق استعمال کیا تھا اس کا مدعا یہ تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک میں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا، میرا ہی قانون یہاں قانون مانا جائے گا۔ میری ذات ہی یہاں امر و نہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی کوئی دوسرا یہاں حکم چلانے کا مجاز

نہیں ہے۔ ⑲

فرعون کا جواب

یہ موسیٰ کون ہے جو رب العالمین کا نمائندہ بن کر آ کھڑا ہوا ہے اور مجھے اس طرح احکام سنا رہا ہے کہ گویا اصل فرمانروا یہ ہے اور میں اس کا تابع فرمان ہوں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے دربار کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا یٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ "اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں؟" (الزخرف۔ آیت ۵۱)؎ اسی بنا پر وہ حضرت موسیٰ سے بار بار کہتا تھا۔ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِی الْاَرْضِ "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے؟" (یونس۔ آیت ۷۸) اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى "اے موسیٰ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟" (طٰہٰ۔ آیت ۵۷) اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا" (المومن۔ آیت ۲۶) ⑱

؎ اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن ان ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمۂ قانون اور صاحب امر و نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، بہرحال جب تک وہ یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا، اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور ان کو سند جواز عطا کرتے رہیں۔ حقائق کی سمجھ بوجھ رکھنے والا تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لیے الٰہ کا لفظ استعمال کیا تھا، اور یہ اسی معنی میں "حاکمیت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ (الزخرف) ⑭

فصل ۳

دورِ موسوی میں بنی اسرائیل پر فرعونی مظالم

اس مضمون کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے جن میں سے تین اہم آیات درج کی جاتی ہیں۔ (مرتب ین)

(۱) قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ○ (اعراف آیت ۱۲۷)

ترجمہ: "فرعون نے جواب دیا میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے"

واضح ہے کہ ایک دورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانہ میں جاری ہوا تھا اور دوسرا دورِ ستم یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا اور بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً اسی دور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران میں ملا تھا اور جس میں یہی فرعون منفتاح اپنے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اسرائیل کو مٹا دیا گیا۔ اس کا بیج تک باقی نہیں۔ (۱۹)

(۲) وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ○ (الاعراف۔ آیت ۱۴۱)

ترجمہ: "اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

(۳) وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ

مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ (ابراھیم۔ آیت ۶)

ترجمہ: "یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

فرعون کے عہد میں ان کی غلامانہ حیثیت

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (المؤمنون۔ آیت ۴۷)

ترجمہ: "کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔"

اصل الفاظ ہیں "جن کی قوم ہماری عابد ہے"۔ عربی زبان میں کسی کا "مطیع فرمان ہونا" اور اس کا "عبادت گزار ہونا" دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ جو کسی کی بندگی و اطاعت کرتا ہے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے۔ اس سے بڑی اہم روشنی پڑتی ہے۔ لفظ "عبادت" کے معنی پر اور انبیاء علیہم السلام کی اس دعوت پر کہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے سوا ہر ایک کی عبادت چھوڑ دینے کی تلقین جو وہ کرتے تھے اس کا پورا مفہوم کیا تھا۔ مخالفین انبیاء کے نزدیک صرف "پوجا" نہ تھی، ان کی دعوت یہ نہیں تھی کہ صرف پوجا اللہ کی کرو باقی بندگی و اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ وہ انسان کو اللہ کا پرستار بھی بنانا چاہتے تھے اور مطیع فرمان بھی۔ اور ان دونوں معنوں کے لحاظ سے دوسروں کی عبادت کو غلط ٹھہراتے تھے۔ (۳۰)

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "فرعون نے کہا: کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے۔"

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: "(حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا) رہا یہ تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔"

یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا۔ تیرے ہی ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود

نہ تھا۔ اس لیے اس پرورش کا احسان جتانا تجھے زیب نہیں دیتا۔ (۲۱)

بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ :

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (طٰہٰ ۔ آیات ۴۵ تا ۴۷)

ترجمہ: "دونوں نے عرض کیا پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔"

فصل ۴

مصر سے بنی اسرائیل کا خروج

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا
فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ۝ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ
بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ (طٰهٰ۔ آیات ۷۷۔۷۸)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنا لے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔ پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔"

فصل ۵

خروج کے احوال

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ○ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ○ (الشعراء ۔ آیات ۵۲ تا ۵۶)

ترجمہ: ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیے (اور کہلا بھیجا) کہ یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں، اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرکار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ مجتمع نہ تھی بلکہ ملک کے تمام شہروں اور بستیوں میں بٹی ہوئی تھی اور خصوصیت کے ساتھ منف (MEMPHIS) سے رعمسیس تک اس علاقے میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی جسے جُشن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لہٰذا موسیٰؑ کو جب حکم دیا گیا کہ آپ انہیں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا ہے، تو انہوں نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں میں ہدایات بھیج دی ہوں گی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ہجرت کے لیے تیار ہو جائیں اور ایک خاص رات مقرر کر دی ہو گی کہ اس رات ہر بستی کے مہاجرین نکل کھڑے ہوں۔ یہ ارشاد کہ "تمہارا پیچھا کیا جائے گا" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہجرت کے لیے رات کو نکلنے کی ہدایت کیوں کی گئی تھی یعنی قبل اس کے کہ فرعون لشکر لے کر تمہارے تعاقب میں نکلے تم راتوں رات اپنا راستہ اس حد تک طے کر چکو

اس سے فوراً آگے نکل چکے ہوں۔ (۴۲)

اس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحر احمر سے بحر روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن ادھر سے فرعون لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آپہنچا جب کہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورہ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکر فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ "اپنا عصا سمندر پر مار۔" فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ "فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔" اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کا راستہ نکل آیا بلکہ بیچ کا یہ حصہ اوپر کی آیات کے مطابق خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔[1]

فرعون کا تعاقب

فرعون نے لشکر جمع کرتے وقت جو باتیں کہیں وہ اس کی چھپی خوف زدگی کو ظاہر کرتی ہیں جسے وہ بے خوفی کا نمائشی پردہ ڈال کر چھپا رہا تھا۔ ایک طرف وہ جگہ جگہ سے فوجیں بھی فوری امداد کے لیے بلا رہا تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ اسے بنی اسرائیل سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو چھپانا بھی چاہتا تھا کہ مدتہائے دراز کی دبی اور پسی ہوئی قوم جو انتہائی ذلت کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی، اس سے فرعون جیسا قاہر فرمانروا خطرہ محسوس کر رہا ہے، حتیٰ کہ اسے فوری امداد کے لیے فوجیں طلب کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس لیے وہ پیغام اس انداز میں بھیجتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل بیچارے ہیں ہی کیا، کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں جو ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ لیکن انہوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ہمیں ان پر غصہ آگیا ہے اس لیے ہم انہیں سزا دینا چاہتے ہیں اور فوجیں ہم کسی خوف سے نہیں جمع کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف ایک احتیاطی کارروائی ہے۔ ہماری دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی بعید سے بعید بھی امکانی خطرہ ہو تو ہم بروقت اس کی سرکوبی کرنے کے لیے تیار رہیں۔ (۴۳)

فرعون کی غرقابی

سورہ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے

---

[1] یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا اور بیچ کا حصہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا۔ (۴۴)

میں اتر آیا (آیات ۶۱-۶۶) یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے دیکھ رہے تھے (آیت ۵۰) اور سورہ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اٹھا۔ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ "میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں" مگر اس آخری لمحے کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا۔ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً "اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا۔ اچھا آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے" (یونس آیات ۹۰-۹۲) (۲۵)

ایک ضمنی بحث

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ۝ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (الشعراء - آیات ۵۷ تا ۵۹)

ترجمہ: "اس طرح ہم انہیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔ یہ تو ہوا ان کے ساتھ اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔"

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے انہی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کے معنی لازماً یہ ہونے چاہئیں کہ فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل پھر واپس پہنچ گئے ہوں اور آلِ فرعون کی دولت و حشمت ان کے قبضے میں آ گئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآن مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اس آیت کا مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔

سورۂ بقرہ، سورہ مائدہ، سورہ اعراف اور سورہ طٰہٰ میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے اور پھر حضرت داؤدؑ کے زمانہ (۱۰۱۳ - ۹۷۳ ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہ سب اس علاقے میں پیش آئے جو آج جزیرہ نمائے سینا، شمالی عرب، شرقِ اردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ، چشمے، خزانے اور

علاقے بنی اسرائیل کو بخش دیے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور امراء نکالے گئے تھے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ان نعمتوں سے محروم کیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرمادیں۔ یعنی وہ فلسطین کی سرزمین میں باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ قیام گاہوں کے مالک ہوگئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورہ اعراف کی یہ آیت کرتی ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا (آیات ۱۳۶-۱۳۷) "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے اور ان کے بجائے ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے اس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔" یہ برکتوں سے مالا مال سرزمین کا استعارہ قرآن مجید میں عموماً فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقے کا نام لیے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہوا: وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ اور وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا۔ اسی طرح سورہ سبا میں بھی اَلْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا کے الفاظ سرزمین شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ (۴۶)

فصل دوم

بنی اسرائیل پر دورِ غلامی کے اثرات

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (اعراف آیت ۔ ۱۳۸)

ترجمہ: "بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا۔ پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے "اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں"۔

بنی اسرائیل نے جس مقام پر بحرِ احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ شہر سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کے مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہلِ مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مفقہ کے مقام پر تھی جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پر مصریوں کی غلامی نے مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہلِ مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۴۰ برس بعد حضرت موسیٰ کے خلیفہ اوّل حضرت یوشع بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دور کر دو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے اور خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اُسے جس کی پرستش کرو گے چن لو.........
اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات سو ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یوشعؑ کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنہ مصر کی بندگی کے دور میں اس کی رگ رگ کے اندر اتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بت کدہ سامنے آ گیا تھا اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ (۴۷)

فصل ۲

عطائے شریعت

کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کی پہلی طلبی

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (البقرہ، آیت ۵۱)

ترجمہ: "یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا۔"

مصر سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ نے چالیس شبانہ روز کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا تاکہ وہاں اس قوم کے لیے جو اب آزاد ہو چکی تھی قوانین شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا کی جائیں۔ (۲۸)

ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب خروج باب ۲۴ تا ۳۱

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ (الاعراف۔ آیت ۱۴۲)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب و روز کے لیے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔"

مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہو گئیں اور انہیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی تو حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰؑ کوہ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انہیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا کی جائے۔ چنانچہ وہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اس سلسلہ کی پہلی طلبی تھی اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰؑ ایک پورا چلہ پہاڑ پر گزاریں اور روزے رکھ کر شب و روز عبادت اور تفکر و تدبّر کر کے اور دل و دماغ کو یکسو کر کے اس قولِ ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشے میں نبی صالح اور کوہِ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے۔ آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبلِ ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہو کر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فیٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہِ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے چلہ کیا تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹنین کے زمانہ کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔ (۲۹)

الواح پر لکھے ہوئے احکام

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا (اعراف آیت ۱۴۵)

ترجمہ: اس کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی اور اس سے کہا: ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔

بائیبل میں تصریح ہے کہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں اور ان تختیوں پر لکھنے کا فعل بائیبل اور قرآن دونوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعین کر سکیں کہ آیا ان تختیوں پر کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت سے کیا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ استعمال فرمایا تھا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کتاب خروج، باب ۳۱ آیت ۱۸، باب ۳۲، آیت ۱۵-۱۶، استثناء باب ۵ آیت ۶-۲۲) (۳۰)

فصل ۸

گوسالہ پرستی کا فتنہ

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (اعراف - آیت ۱۴۸)

ترجمہ: "موسیٰؑ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ نہ وہ ان سے بولتا ہے اور نہ کسی معاملے میں ان کی رہنمائی کرتا ہے مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے۔"

یہ اُس مصریت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا اس سے یہ قوم اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعون کا غرق ہونا، ان لوگوں کا بخیریت اس بند غلامی سے نکل آنا جس کے ٹوٹنے کی کوئی امید نہ تھی اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے، کسی دوسرے کی طاقت اور تصرف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا مگر اس پر بھی انہوں نے پہلے تو پیغمبر سے مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر پیغمبر کے پیٹھ موڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیاء بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو اس بدکار عورت سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا ہر دوسرے مرد سے دل لگاتی ہو اور جو شب اول میں بھی بےوفائی سے نہ چوکی ہو (۳۱)

گائے بیل کی پرستش کا رواج عام

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰىٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ (البقرہ ۔ آیت ۵۱)

ترجمہ :۔ "یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرار داد پر بلایا تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے ۔ اس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی۔"

گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا ۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا ۔ حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انہوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا ۔ (بچھڑے کی پرستش کا واقعہ بائبل کی کتاب خروج باب ۳۲ میں تفصیل سے درج ہے) (۳۲)

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ (سورہ طٰہٰ ۔ آیات ۸۳ تا ۸۶)

ترجمہ : "(حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا) اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی اے موسیٰ ؟ (موسیٰ نے عرض کیا) "وہ بس میرے پیچھے آ رہے ہیں میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں ، اے میرے رب ، تا کہ تو مجھ سے خوش ہو جائے ۔" فرمایا " اچھا ، تو سنو ، ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا ۔"

طور سے واپسی اور فتنے کی تحقیقات

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ڛ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ڛ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ڛ .... ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ

ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ (سورۃ طٰہٰ۔ آیات ۸۶ تا ۹۷)

ترجمہ: "موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جاکر اُس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟" انہوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ لاکر ڈالا۔ اور اُن کے لیے ایک بچھڑے کی صورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اُٹھے، یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا، موسیٰ اسے بھول گیا۔" کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ہارونؑ (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ان سے کہہ چکا تھا کہ "لوگو، تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمہارا رب تو رحمان ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔" مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آجائے۔" موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارونؑ کی طرف پلٹا اور) بولا "ہارونؑ، تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟" ہارونؑ نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔" موسیٰؑ نے کہا "اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟" اس نے جواب دیا "میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا۔" موسیٰؑ نے کہا "اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا۔ اور تیرے لیے بازپرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے طور کی جانب ایمن میں جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ

حضرت موسیٰؑ ایک ہی روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ (۴۳)

پیروانِ سامری کا عذر

جو لوگ سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے ان کا عذر یہ تھا کہ ہم نے تو زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لد گئے تھے" اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائیبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگ کر لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا ہو بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ نے ان کو سکھایا تھا اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی، بائیبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے۔

"خدا نے موسیٰؑ سے کہا۔۔۔۔۔۔ جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ۔۔۔۔۔ کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی، ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے۔" (باب [illegible]۔ آیت ۱۴ تا ۲۲)

"اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا۔۔۔۔۔ سو اب تو لوگوں کے کان میں بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا۔" (باب ۱۱۔ آیت ۲۔۳)

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا انہوں نے دے دیا سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔" (باب ۱۲۔ آیت ۳۵۔۳۶)

لہ یہ ہے وہ کتاب جسے یہود و نصاریٰ خدا کا کلام کہتے ہیں۔ قرآن مجید کا بیان اس کی اس روایت کو غلط قرار دیتا ہے اور [illegible] صورت [illegible] کرتا ہے۔ (مؤلف)

بنی اسرائیل کا یہ قول کہ "اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا"۔ اس کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات لادے پھرنے سے لوگ تنگ آ گئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات طے پائی ہوگی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے۔ پھر ان کو گلا کر اینٹوں اور سلاخوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جا سکے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لا لا کر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہوگا۔ (۳۴)

بنی اسرائیل کے اس عذر کے بعد کی عبارت پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قوم کا جواب "پھینک دیا تھا" پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورت واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پیش آنے والے فتنے سے بے خبر اپنے اپنے زیور لا لا کر ڈھیر کرتے چلے گئے اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ بعد میں زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی صورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصوروار ہوں، یہ تمہارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔ (۳۵)

سامری کی فتنہ طرازی اور اس کی سزا

سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ اس پر مزید جسارت یہ بھی کی کہ خود حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک پُرفریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا تھا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریلؑ ہی ہوں جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت

لازم آتی ہو اور لغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گڑھے ہوئے اس پر فریب افسانے کو سنتے ہی اس کے منہ پر مار دیا گیا۔ (۳۶)

حضرت موسیٰؑ نے سامری سے جو بات فرمائی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اس کو اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دور ہی سے لوگوں کو مطلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائیبل کی کتاب احبار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ بس وہ اکیلا رہے، اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو" (باب ۱۳ - آیت ۴۵ - ۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا۔ یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اخلاقی کوڑھ کے اس مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہے کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔ (۳۷)

گوسالہ پرستی پر بنی اسرائیل کا معافی مانگنا

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا (اعراف۔ آیت ۱۵۵)

ترجمہ: "اور موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ستر نمائندوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں"۔

یہ طلبی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے ستر نمائندے کوہ سینا پر پیشی خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے گوسالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور از سرِ نو اطاعت کا عہد استوار کریں۔ بائیبل اور تلمود میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں البتہ یہ ذکر ہے کہ جو تختیاں حضرت موسیٰؑ نے پھینک کر توڑ دی تھیں۔ ان کے بدلے

دوسری تختیاں حاصل کرنے کے لیے آپ کو کوہِ سینا پر بلایا گیا۔ (خروج باب ۳۴) (۳۸)

شرک کے مجرمین کو سزا

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ (البقرہ۔ آیت ۵۴)

ترجمہ: "یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا تو اس) نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہٰذا تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔"

یعنی اپنے اُن آدمیوں کو قتل کرو جنہوں نے گوسالے کو معبود بنایا اور اس کی پرستش کی۔ (۳۹)

فتنہ کی بیخ کنی کے بعد تنظیم نو

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا (الاعراف۔ آیت ۱۶۰)

ترجمہ: "اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل شکل دے دی تھی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابانوں میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے بارہ گھرانوں کو جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں اور حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے، الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظم کیا اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوبؑ کے بارہویں بیٹے لاوی کی اولاد، جس کی نسل سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ تھے، ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمعِ حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے۔ (۴۰)

فصل ۹

بیابانِ سینا میں اللہ تعالیٰ کے احسانات

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ
وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ

(الاعراف۔ آیت ۱۶۰)

ترجمہ: "اور جب موسیٰؑ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا۔"

تین بڑے احسانات

اوپر جس تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ منجملہ ان احسانات کے تھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد اب مزید تین احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقہ میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔[1] دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔[2] تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من و سلویٰ کے نزول کی شکل میں کیا گیا۔

---

[1] وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لیے الگ چشمہ نکال دیا تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔

[2] یعنی جزیرہ نمائے سینا میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمہیں میسر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمہارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل آئے تھے اور سینا کے علاقہ میں مکانات رہائش کے لیے

ظاہر ہے کہ ان تینوں اہم ترین ضروریات زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقہ میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آ ٹھہرے، تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نمائے سینا کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت پانچ چھ لاکھ فوج وہاں لے جانا چاہے تو اس کے مدبروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے اس حصے سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائیبل اور قرآن میں آیا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوب اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں تک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکتی تھی، خصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا، اور دوسری طرف مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ (۴۱)

مَن و سلویٰ کا نزول

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۵۷)

ترجمہ: "اور ہم نے من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں کھاؤ، مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انہوں نے آپ اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کھاتو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اس علاقہ میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا، تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔ (از مؤلف)

اور پکایا۔"

من اور سلویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں ان لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ من دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی۔ اور سلویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (۴۲)

مزید تفصیل

بائیبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشت سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی، اس وقت من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج باب ۱۶۔ گنتی باب ۱۱ آیت ۷-۹۔ یشوع، باب ۵، آیت ۱۲) کتاب خروج میں من و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

"یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے؟"

(باب ۱۶۔ آیت ۱۳-۱۵)

"اور بنی اسرائیل نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا۔" (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

"لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے۔ پھر اسے ہانڈیوں میں ابال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ من بھی گرتا تھا۔" (باب ۱۱۔ آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے

تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش اور جستجو کرنے والوں نے ان علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک دشت نوردی کی تھی۔ مَن ان کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خوش عقیدوں کو بے وقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔ (۴۳)

فصل ۱۸

خدائی احسانات کے جواب میں بنی اسرائیل کا ٹیڑھا رویّہ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۔ (البقرۃ - ۵۵)

ترجمہ: "یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں (اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا"

یہ اشارہ جس واقعہ کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر جب حضرت موسیٰؑ طور پر تشریف لے گئے تھے، تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی، تو آپ نے اسے ان نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انہیں سزا دی گئی لیکن بائیبل کہتی ہے کہ:

"انہوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا، جو آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا، سو انہوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا پیا" (خروج، باب ۲۴ - آیت ۱۰ - ۱۱)

لطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا کہ مجھے اپنا جلال دکھا دے، تو اس نے فرمایا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ (دیکھو خروج، باب ۳۳ - آیت ۱۸ - ۲۳) (۴۴)

بے صبر ہو کر شہری غذائیں مانگتے ہیں

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ

لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (سورہ البقرہ آیت ۶۱)

ترجمہ: "یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا، کیا ایک بہتر چیز کے بجائے ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ اچھا کسی شہری آبادی میں جا رہو جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لیے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے تم سے صحرا نوردی کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی زیادہ مرغوب ہے کہ اس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو گنتی، باب ۱۱، آیت ۴-۹) (۴۵)

ایک بستی کی فتح اور بنی اسرائیل کا کردار

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ ؕ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (البقرہ ۵۸، ۵۹)

ترجمہ: "پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ "یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے داخل ہونا اور کہتے جانا حِطَّةٌ حِطَّةٌ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے

۔ فرمائی ہوگی مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کرتے رہے تھے۔"

یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے کون سی بستی مراد ہے جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہوگا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد شطیم ہو، جو یریحو کے بالمقابل دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے۔ (گنتی باب ۲۵، آیت ۱-۸) (۳۶)

یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا، جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ "حِطَّۃٌ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔ (۳۷)

گائے ذبح کرنے کا حکم اور ان کی حیلہ جوئی

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْــٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (البقرۃ، آیات ۶۷ تا ۷۱)

ترجمہ: "پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا

حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰؑ نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والے کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے؟ ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔

موسیٰؑ نے جواب دیا،

"اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے، اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔"

چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا تھا، دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا، اس لیے انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی وہ تفصیلات پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائبل میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

(ملاحظہ ہو گنتی، باب ۱۹- آیت ۱-۱۰) (۴۸)

قتل کا ایک واقعہ

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (البقرہ - آیات ۷۲-۷۳)

ترجمہ: "اور تمہیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی[1]، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

اس مقام پر یہ بات تو صریح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی "لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ"، اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انہیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی نہ کہ اس کا ذبح ہونا الٹا مفید ثابت ہو۔ (۴۹)

بیت المقدس میں داخلے کا حکم

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ .... يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ

---

[1] بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی پر یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔ یہ قوم وطن چھوڑ کر خدا پرستی کے لیے بیابان نوردی کر رہی ہے مگر اس مقدس مقصد اور سفر کے باوجود قتل جیسے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ (تبیین)

لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ (المائدہ ۵ - آیات ۲۰ تا ۲۶)

ترجمہ: اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا ـــــ "اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام پلٹو گے۔ انہوں نے جواب دیا اے موسیٰؑ، وہاں تو بڑے بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ انہوں نے کہا ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو۔ لیکن انہوں نے پھر یہی کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اس پر موسیٰؑ نے کہا۔ اے رب میرے! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔ اللہ نے جواب دیا اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے۔ ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔"

اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کر لو۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جب کہ مصر سے نکلنے کے تقریباً دو سال بعد آپ اپنی قوم کو لیے ہوئے دشتِ فاران میں خیمہ زن تھے۔ یہ بیابان، جزیرہ نمائے سینا میں عرب کی شمالی اور فلسطین کی جنوبی سرحد سے متصل واقع ہے۔

بنی اسرائیل کی دُون ہمتی

اس قصے کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی، استثناء اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت

موسیٰ نے دشتِ فاران سے بنی اسرائیل کے ۱۲ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کرکے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کرکے وہاں سے واپس آئے اور انہوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ "واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں ..... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں ..... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے"۔ یہ بیان سن کر سارا مجمع چیخ اٹھا کہ "اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مر جاتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کروانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں"۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ "آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں"۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا "چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں"۔ پھر دونوں نے یک زبان ہوکر کہا "اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا ..... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو، اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو ..... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، ان کا خوف نہ کرو"۔ مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "انہیں سنگسار کردو"۔ آخرکار اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یوشع اور کالب کے سوا اس قوم کے بالغ مردوں میں سے کوئی بھی اس سرزمین میں داخل ہونے نہ پائے گا، یہ قوم چالیس برس تک بے خانماں پھرتی رہے گی، یہاں تک کہ جب ان میں سے ۲۰ برس سے لے کر اوپر کی عمر تک کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اٹھے گی تب انہیں فلسطین فتح کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

چنانچہ اس فیصلۂ خداوندی کے مطابق بنی اسرائیل کو دشتِ فاران سے شرق اردن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۳۸ برس لگ گئے۔ اس دوران میں وہ سب لوگ مر کھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے۔ شرق اردن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع بن نون کے عہد خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کرسکیں۔ (۵۰)

فصل ۱۱

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کی آخری وصیت

بائیبل میں آپ کی روایت شدہ تقریر

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراهیم - ۷)

ترجمہ: "اور یاد رکھو تمہارے رب نے (بنی اسرائیل کو) خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔ اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔"

اس مضمون کی تقریر بائیبل کی کتاب استثناء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں پھر تورات کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے۔ پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی۔ یہ خطبہ کتاب استثناء کے ابواب نمبر ۴-۶-۸-۱۰-۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ مؤثر و عبرت انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کا اندازہ ہو سکتا ہے:

"سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کے ساتھ محبت رکھ۔ اور یہ باتیں جن کا حکم آج میں تجھے دیتا ہوں تیرے دل پر نقش رہیں۔ اور تو ان کو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا۔ اور گھر بیٹھے راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے ان کا ذکر کرنا۔" (باب ۶۔ آیات ۴-۷)

"پس اے اسرائیل! خداوند تیرا خدا تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کا خوف مانے اور اس کی سب راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آئین جو میں تجھ کو آج بتاتا ہوں ان پر عمل کرے تاکہ تیری خیر ہو۔ دیکھ آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے۔" (باب ۱۰ - آیات ۱۲-۱۴)

"اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک۔۔۔۔ خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ خداوند تیرے انبارخانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ ڈالے برکت کا حکم دے گا۔۔۔۔ تجھے اپنی پاک قوم بنا کر رکھے گا اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی۔ تو بہت سی قوموں کو قرض دے گا پر خود قرض نہیں لے گا اور خداوند تجھے دم نہیں بلکہ سر ٹھہرائے گا۔ اور تو پست نہیں بلکہ سرفراز ہی رہے گا" (باب ۲۸ - آیات ۱-۱۳)

لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہو۔۔۔ خداوند ان سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور پھٹکار اور اضطراب کو تجھ پر نازل کرے گا۔۔۔ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی۔۔۔ آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی۔۔۔۔ خداوند تجھے تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا تو ان کے مقابلے کے لیے ایک ہی راستہ سے جائے گا مگر ان کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا۔۔۔۔ عورت سے منگنی تو تو کرے گا پر دوسرا اس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بنائے گا لیکن اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا پر اس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائے گا۔۔۔۔ بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے ان دشمنوں کی خدمت کرے گا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا اور غنیم تیری

گردن پر لوہے کا جُوا رکھے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے ۔ ۔ ۔ خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دے گا۔"

(باب ۲۸ ۔ آیات ۱۵۔۶۴) (۵۱)

باب ۳

یہودکا بگاڑ اور اُس کے نتائج

فصل ۱

یہود کا اخلاقی تنزل اور سیاسی پراگندگی

موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا۔ ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور ایک سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دے کر چھوڑ دیا تھا جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی اور ایمانی روح کی بہت کمی تھی۔ چند صدیوں تک بنی اسرائیل اس شریعت کے پابند رہے مگر بعد کے زمانہ میں جب ان کے معاملات نے وسعت اختیار کی تو وہ کمی جو شریعت میں رہ گئی تھی، رنگ لانے لگی۔ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت خراب ہوتی چلی گئی اور فساد اخلاق کا طبعی نتیجہ اضمحلال قومی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تفرقہ و تصادم اور اس کے نتائج

پہلے ان کی جماعت کا شیرازہ منتشر ہوا، پھر منتشر اجزاء میں باہم تصادم شروع ہوا، اور آخر میں غلامی کی لعنت ان پر مسلط ہو گئی جس نے انہیں پستی و تنزل کی انتہا کو پہنچا دیا۔ مسیح کی پیدائش سے ۷۲۰ برس پہلے اشوریوں نے ان کو مغلوب کیا اور دو صدی تک وہ اور ان کے بعد اہل بابل، انہیں پیستے رہے۔ پھر ۵۳۶ ق م میں ایرانی آ گئے اور دو سو برس تک ان کا دورہ رہا۔ ان کے بعد سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ان کو مغلوب کیا (۳۳۲ تا ۳۲۳ ق م) اور سکندر کی وفات کے بعد مصر کے بطالسہ (PTOLEMIES) نے ان کو اپنا علاقہ گوشہ بنا لیا۔ اس طرح ایک صدی تک بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں رہے۔ پھر ۱۹۸ ق م میں ایک دوسرے یونانی خاندان سلیوکیڈیا نے ان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور جبراً ان میں صنم پرستی کو داخل کیا۔

یہودی حکومت کا قیام اور تباہی

دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں یہودیوں کو کچھ آزادی کا احساس ہوا اور انہوں نے بغاوت کر کے [illegible] ق م میں ایک آزاد یہودی حکومت قائم کر لی جو تقریباً ۸۰ برس تک زندہ رہی مگر ان کے اخلاق اس قدر بگڑ چکے تھے

کہ جماعت کا شیرازہ بندھنا مشکل تھا، اس لیے ان میں پھوٹ پڑی اور انہوں نے خود ہی رومیوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ مسیح کی پیدائش سے ۶۰ برس پہلے رومیوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور جب مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ سات آٹھ صدی تک بابل و آشور کے ستارہ پرستوں، ایران کے آتش پرستوں اور یونان و روم کے صنم پرستوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے باعث اس قوم کے اندر اخلاق، شرافت، دینداری اور انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

بائیبل میں یہودیوں کے اخلاقی تنزل کا ریکارڈ

خود بائیبل کے عہد عتیق میں یہودیوں کے اس اخلاقی و روحانی تنزل کی تفصیلات ہم کو بکثرت ملتی ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کے بادشاہ منسی (MANESSAH) نے اہل بابل کے اثر سے ارض مقدس میں جن گمراہیوں کو رواج دیا۔ اس کی کیفیت ۲ سلاطین باب ۲۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے،

"اس نے اونچے مکانوں کو جنہیں اس کے باپ حزقیاہ نے ڈھایا تھا، پھر بنایا اور بعل کے لیے مذبحے بنائے اور یسیرت بنائی جس طرح اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے کیا تھا اور آسمان کی ساری فوج (یعنی اجرام فلکی) کی پرستش کی اور ان کی بندگی کی۔ اس نے خداوند کے اس گھر میں جس کی بابت خداوند نے فرمایا تھا کہ میں یروشلم میں اپنا نام رکھوں گا، مذبح بنائے۔ اس نے آسمان کی ساری فوج کے لیے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے۔ اس نے اپنے بیٹے کو آگ میں گزارا اور شگون کو مانا اور جادوگری کی، دیوؤں اور افسون گروں سے یاری کی...... اس نے یسیرت کی مورت کو جسے اس گھر میں نصب کیا جس کی بابت خداوند نے داؤد کو اور اس کے بیٹے سلیمان کو کہا تھا کہ اسی گھر میں اور یروشلم میں، جسے میں نے بنی اسرائیل کے سب فرقوں میں سے چن لیا ہے، میں اپنا نام ابد تک رکھوں گا۔"

ہوسیع نبی کا بیان

اس عہد کی اخلاقی حالت کو ہوسیع نبی (۷۸۰۔ ۷۲۵ ق م) نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اس سرزمین کے بسنے والوں سے خداوند کا ایک جھگڑا ہے کیونکہ ملک میں نہ راستی ہے، نہ شفقت نہ خدا شناسی۔ کوسنے اور جھوٹ بولنے اور خون اور چوری اور حرام کاری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ پھوٹ نکلے ہیں اور خون پر خون ہوتا ہے اس لیے یہ سرزمین ماتم کرے گی اور ہر ایک جو اس میں

روتا ہے جنگل کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں سمیت ناتواں ہو جائے گا۔" (۴: ۱-۳)

یسعیاہ نبی کا بیان

۷۴۰ء - ۷۰۰ ق م میں یسعیاہ نبی کہتے ہیں:

"تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل سست ہے۔ تلوے سے لے کر چندیا تک اس میں کہیں صحت نہیں ہے بلکہ زخم اور چوٹ اور سڑتے ہوئے گھاؤ ہیں ..... تمہارا ملک اُجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں۔ وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اُجاڑا ہے۔" (۱: ۵-۷)

"وہ بستی جو سراسر پاک دامن تھی کیسی چھنال ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی، راست بازی اس میں بستی تھی، پر اب خونی رہتے ہیں۔ تیری چاندی میل ہو گئی۔ تیری مے میں پانی مل گیا۔ تیرے سردار گردن کش چوروں کے شریک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی۔" (۱: ۲۱-۲۳)

"اُن کے جشن کی محفلوں میں بربط اور بین اور بانسری کا زور ہے لیکن وہ خداوند کے کام پر غور نہیں کرتے اور اس کے ہاتھوں کی کاریگری کو نہیں دیکھتے۔ اس لیے میری قوم اسیری میں مبتلا ہو گئی ہے کیونکہ وہ علم نہیں رکھتی۔ اُن کے عزت والے بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے خشک ہوئے جاتے ہیں۔ اس لیے دوزخ نے وسعت اختیار کر لی ہے اور اپنا منہ بے اندازہ پھاڑ دیا ہے۔ ان کے شان و شوکت والے اور عوام اور تمام فخر کرنے والے اس میں جا پڑیں گے۔" (۵: ۱۲-۱۴)

"ان پر واویلا ہے جو مے پینے میں زور آور اور نشہ کی چیزیں ملانے میں طاقت ور ہیں، جو رشوت کی خاطر بدکاروں کو صادق ٹھہراتے ہیں اور صادقوں سے ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ سو جس طرح آگ بھوسی کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا پھونس بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ان کی جڑ بوسیدہ ہو گی اور ان کی کلی گرد کی طرح اڑ جائے گی، کیونکہ انہوں نے رب الافواج کی شریعت کو ناجائز ٹھہرایا اور اسرائیل کے قدوس کے سخن کو ذلیل جانا۔" (۵: ۲۲-۲۴)

میکاہ نبی کا بیان

اسی عہد کے ایک اور نبی حضرت میکاہ کہتے ہیں:

"اے یعقوب کے سردارو! اور بنی اسرائیل کے قاضیو! تم وہ ہو جو نیکی سے کینہ رکھتے ہیں اور بدی کو پیار کرتے ہیں، جو لوگوں کا پوست ان پر کھینچتے ہیں اور ان کی ہڈیوں کو توڑتے ہیں اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں" (میکاہ ۳: ۲-۳)

"تم کہ عدالت سے عداوت رکھتے ہو اور ساری راستی کو الٹا دیتے ہو، اس بات کو سنو! تم صیہون کو خون ریزی سے اور یروشلم کو بے انصافی سے تعمیر کرتے ہو۔ اس کے سردار رشوت لے کر عدالت کرتے ہیں اور اس کے کاہن اجرت لے کر تعلیم دیتے ہیں اور اس کے نبی روپیہ لے کر فال کھولتے ہیں" (۳: ۹-۱۱)

متذکرہ بیانات کا ماحصل

انبیائے بنی اسرائیل کے ان اقوال سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں سے شریعت کی اصل روح یعنی ایمان، صداقت، دیانت، عدل، انصاف اور پاکیزگی اخلاق رخصت ہو چکی تھی۔ حرام خوری، حرص و طمع، ظلم و جفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا۔ ان کے حاکم، ظالم، ان کے پیشوا ریاکار، ان کے سردار خائن اور ان کے غلام معصیت پیشہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم و شعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا جو ہر شریعت حقہ کے احکام میں مقصود اصلی ہوتی ہے۔

انبیاء کی مساعئ اصلاح

اس روز افزوں پستی و ظاہر پرستی کو دیکھ کر مسیحؑ سے بہت پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے مواعظ و نصائح سے ان کو بھولی ہوئی حقیقت یاد دلانی شروع کر دی تھی کہ خدا محض قربانیوں اور دعاؤں سے خوش نہیں ہوتا بلکہ صداقت، ترحم اور نیک معاملت سے خوش ہوتا ہے اور اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے عفو و درگزر اور محبت و ایثار کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بائبل میں انبیاء متأخرین کے ایسے نصائح ہم کو بکثرت ملتے ہیں۔ یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:

"خداوند فرماتا ہے تمہارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟ میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں اور فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہو چکا ہوں۔ میں بیلوں اور بھیڑوں اور بکریوں کا لہو نہیں چاہتا۔۔۔۔۔ اب میرے سامنے جھوٹے نذرانے مت لاؤ، لوبان سے مجھے نفرت ہے، اور نوچندی اور سبت اور جماعت جمع کرنے سے بھی، کیونکہ میں عید اور بے دینی دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تمہاری

بچھڑوں اور تمہاری عیدوں سے بیزار ہے۔ وہ مجھ پر وبال ہیں۔ میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا۔ جب تم اپنے ہاتھ پھیلاؤ گے میں تم سے اعراض کروں گا، جب تم دعاؤں پر دعائیں مانگو گے تو میں نہ سنوں گا کیونکہ تمہارے ہاتھ تو لہو سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنے تئیں دھو کر پاک کرو۔ اپنے بُرے کاموں کو میرے سامنے سے دور کرو۔ بدکاری سے باز آؤ۔ نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو بنو۔ مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں کی فریادرسی کرو۔ بیواؤں کے حامی بنو...... اگر تم راضی اور فرمانبردار ہوگے تو زمین سے اچھے پھل کھاؤ گے اور اگر انکار کرو گے اور بغاوت اختیار کرو گے تو تلوار کا لقمہ بن جاؤ گے۔" (۱: ۱۱-۲۰)

ایک دوسرے موقع پر یسعیاہ نبی عبادات و اعمال کی معنوی روح اور فضیلت اخلاق کا درس اس طرح دیتے ہیں:

"تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ لڑائی جھگڑا کرو اور خباثت کے مکے مارو۔ اس طرح کا روزہ جیسا کہ آج کل تم رکھتے ہو، مطلوب نہیں ہے۔ کیا یہی وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن جس میں آدمی اپنی جان کو فضول دکھ دے اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکا دے اور ٹاٹ اور راکھ کی طرح بچھا دے؟ کیا تم اس کو روزہ اور خدا کا منظورِ نظر دن کہو گے؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں ہے کہ ظلم کی زنجیریں توڑی جائیں، جوئے کے بندھن کھولے جائیں، مظلوموں کو آزاد کیا جائے، بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالا جائے؟ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں پناہ دے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنا دے، اور تو اپنے ہم جنسوں سے منہ نہ چھپائے؟..... اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو سیر کرے تو تیرا نور تاریکی میں طلوع کرے گا، اور تیری تیرگی نصف النہار کی طرح چمک اٹھے گی۔" (۵۸: ۴-۱۰)

ایک اور نبی حضرت میکاہؑ اسی روحانی تعلیم کی اس طرح تجدید کرتے ہیں:

"میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں جاؤں گا؟ کیونکر خدائے تعالیٰ کو سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور ایک سالہ بچھڑوں کو لے کر اس کے آگے جاؤں گا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی روح کی خطا کے عوض دے سکوں گا؟ نہیں اے انسان، اس نے تجھے وہ راہ دکھادی

سے جو نیک ہے۔ خداوند تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو انصاف کرے، رحم دلی کو پیار کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے" (۸-۶:۶)

یہ تعلیم سات صدیوں تک بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آتی رہی۔ بنی اسرائیل کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ ان میں جو اخلاقی مفاسد پیدا ہو گئے تھے انہیں دور کرنے کے لیے ایک زیادہ طاقتور مصلح کی ضرورت تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے اسی میکاہ اور یسعیاہ والی تعلیم کو نئے جوش اور نئی روح کے ساتھ پیش کیا۔ انبیاء سابقین کی طرح ان کی تعلیم بھی شریعت موسویہ کو منسوخ کرنے اور اس کی جگہ کوئی الگ مذہب قائم کرنے کے لیے نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو موسوی شریعت میں باقی رہ گئی تھی، اور اس اخلاقی فضیلت کی روح کو ملتِ یہود میں پھونکنا تھا جس کی وہ ضرورت مند تھی۔ اس وقت یہودی اخلاق میں راست بازی، دیانت، حلم، عفو، زہد، قناعت، بے غرضی، خدا ترسی، رحم، فروتنی اور ایثار کی کمی تھی۔ وہ حد سے زیادہ طماع، دنیا پرست، بندۂ غرض اور دنی الطبع ہو گئے تھے۔ ان میں دینداری کی روح باقی نہ رہی تھی جو انسانیت کی جان ہے۔ (۵۲)

فصل ۷

انبیاؑ کی مسلسل تنبیہات

تنبیہ جو بار بار کی جاتی رہی

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ (اعراف۔ آیت ۱۶۷)

ترجمہ "اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے"۔

یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کے مجموعہ کتب مقدسہ میں یسعیاہ اور یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاؑ کی تمام کتابیں اسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ پھر یہی تنبیہ مسیح علیہ السلام نے انہیں کی جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے ان کی توثیق کی اب یہ بات قرآن اور اس سے پہلے صحیفوں کی صداقت میں ایک بیّن شہادت ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامالی نہ جاتی رہی ہو۔[۱] (۵۳)

---

[۱] ریاست "اسرائیل" ان کی اپنی سعی کا نتیجہ نہیں بلکہ دوسروں کی مدد سے قائم ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران۔ ۱۱۲)۔

ترجمہ "ان پر ذلت مسلط کر دی گئی جہاں بھی وہ پائے جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے اور انسانوں کی طرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے"۔

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب کھدیڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ بخیریت رہے ہیں اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیے ہوئے مواقع کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے (باقی حاشیہ ۸۹)

دو فسادوں کے بارے میں انتباہ

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ
لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل۔ آیت ۴)

ترجمہ: "ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤگے"

حضرت داؤدؑ کی زبان سے اولین تنبیہ

بائیبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں یہ تنبیہات مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ پہلے فساد اور اس کے برے نتائج پر بنی اسرائیل کو زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں متنبہ کیا گیا ہے اور دوسرے فساد اور اس کی سخت سزا کی پیش گوئی حضرت مسیحؑ نے کی ہے جو متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔ ذیل میں ہم ان کتابوں کی متعلقہ عبارتیں نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق ہو جائے۔

پہلے فساد کے ظہور پر تباہی کی خبر

پہلے فساد پر اولین تنبیہ حضرت داؤدؑ نے کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں:

"انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا، بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے۔ بلکہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ حمایت جس وقت بھی ہٹے گی اس ریاست کا حشر دنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ زندۂ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا نہ برستا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں نہ کہیں جا بستی ہے تو کہیں اسے پناہ مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ ڈھائی ہزار برس سے لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کے مصداق اس دنیا میں جیے جا رہی ہے۔ (۵۳)

لوگوں کے دل میں یہ شک گزرنے لگتا ہے کہ یہ بات (اسرائیلی ریاست کا قیام) قرآن کی پیشگوئی کے خلاف ہے۔ لیکن یہ ریاست اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ، انگلستان اور فرانس کے سہارے قائم ہوئی ہے اور دنیا بھر سے یہودی اس چھوٹے سے خطے میں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ جس روز بھی یہ مغربی طاقتیں کسی بڑی جنگ میں الجھ کر اسرائیل کی حمایت کے قابل نہ رہیں گی، وہی دن ان کے لیے پیغام موت ثابت ہوگا اور گرد و پیش کی عرب آبادی اس گندگی کے پلندے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ بظاہر تو یہودیوں کی کامیابی نظر آتی ہے کہ انہوں نے مغربی قوموں کی مدد سے عرب کی سرزمین میں زبردستی ایک قومی وطن حاصل کیا ہے مگر در اصل یہ ان کے لیے ایک بہت بڑے عذاب کی تمہید ہے۔ (تفہیمات ص ۲۹۲)

بہلایا ...... اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی اور اُس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔"

(باب ۱۰۶ - آیات ۳۴ - ۴۱)

اس عبارت میں ان واقعات کو جو بعد میں ہونے والے تھے، بصیغہ ماضی بیان کیا گیا ہے گویا کہ وہ ہو چکے۔ یہ کتب آسمانی کا خاص انداز بیان ہے۔

پھر جب یہ فساد عظیم رونما ہو گیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت یسعیاہ نبی اپنے صحیفے میں یوں دیتے ہیں:

آہ! خطاکار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، مکار اولاد، جنہوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے، تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اور مار کھاؤ گے؟" (باب ۱- آیت ۴ - ۵)

"وفادار بستی کیسی بدکار ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی اور راست بازی اس میں بستی تھی لیکن اب خونی رہتے ہیں ...... تیرے سردار گردن کش اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے خداوند رب الافواج اسرائیل کا قادر یوں فرماتا ہے کہ آہ، میں ضرور اپنے مخالفوں سے آرام پاؤں گا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا۔" باب ۱- آیت ۲۱-۲۴)

"وہ اہل مشرق کی رسوم سے پُر ہیں اور فلستیوں کی مانند شگون لیتے اور بیگانوں کی اولاد کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں ...... اور ان کی سرزمین بتوں سے بھی پُر ہے وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی اپنی ہی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔" (باب ۲- آیت ۶ - ۸)

"اور خداوند فرماتا ہے چونکہ صیہون کی بیٹیاں (یعنی یروشلم کی رہنے والیاں) متکبر ہیں اور گردن کشی اور شوخ چشمی سے خراماں ہوتی اور اپنے پاؤں سے ناز رفتاری کرتی اور گھنگرو بجاتی جاتی ہیں اس لیے خداوند صیہون کی بیٹیوں کے سر گنجے اور ان کے بدن بے پردہ کر دے گا ...... تیرے بہادر تہ تیغ ہوں گے اور تیرے پہلوان جنگ میں قتل ہوں گے۔ اس کے پھاٹک ماتم اور نوحہ کریں گے اور وہ اجاڑ ہو کر خاک پر بیٹھے گی۔" (باب ۳- آیت ۱۶ - ۲۶)

"اب دیکھ، خداوند دریائے فرات کے سخت شدید سیلاب، یعنی شاہ اسور (اسیریا) اور اس کی ساری شوکت کو ان پر چڑھا لائے گا اور وہ اپنے سب نالوں پر اور اپنے سب کناروں پر بہہ نکلے گا۔" (باب ۸۔ آیت ۷)

"یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں جو خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں، جو غیب بینوں سے کہتے ہیں کہ غیب بینی نہ کرو اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوشگوار باتیں سناؤ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو..... پس اسرائیل کا قدوس یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم اس کلام کو حقیر جانتے ہو اور ظلم اور کجروی پر بھروسا کرتے ہو اور اسی پر قائم ہو۔ اس لیے یہ بدکرداری تمہارے لیے ایسی ہوگی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے..... وہ اسے کمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا۔ اسے بے دریغ چکنا چور کرے گا۔ اس کے ٹکڑوں میں ایک ٹھیکرا بھی ایسا نہ ملے گا جس پر چولہے میں سے آگ یا حوض سے پانی لیا جائے۔" (باب ۳۰۔ آیت ۹۔۱۴)

آخری لمحے پر یرمیاہ نبی کی آواز

پھر جب سیلاب کے بند بالکل ٹوٹنے کو تھے تو یرمیاہ نبی کی آواز بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

"خداوند یوں فرماتا ہے کہ تمہارے باپ دادا نے مجھ میں کون سی بے انصافی پائی کہ وہ مجھ سے دور ہو گئے اور بطلان کی پیروی کر کے باطل ہوئے؟..... میں تم کو باغوں والی زمین میں لایا کہ تم اس کے میوے اور اس کے اچھے پھل کھاؤ، مگر جب تم داخل ہوئے تو تم نے میری زمین کو ناپاک کر دیا اور میری میراث کو مکروہ بنایا..... مدت ہوئی کہ تو نے اپنے جوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں تابع نہ رہوں گی۔ ہاں، ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے تو لیٹ گئی (یعنی ہر طاقت کے آگے جھکی اور ہر بت کو سجدہ کیا)..... جس طرح چور پکڑا جانے پر رسوا ہوتا ہے اسی طرح اسرائیل کا گھرانا رسوا ہوا۔ وہ اور اس کے بادشاہ اور امراء اور کاہن اور (جھوٹے) نبی جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنم دیا، انھوں نے میری طرف منہ نہ کیا بلکہ پیٹھ کی، پر اپنی مصیبت کے وقت وہ کہیں گے کہ اٹھ کر ہم کو بچا۔ لیکن تیرے وہ بت کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا؟ اور وہ تیری مصیبت کے وقت تجھ کو بچا سکتے ہیں تو اٹھیں، کیونکہ اے یہوداہ! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں۔"

(باب ۲-آیت ۵-۱۸)

"خداوند نے مجھ سے فرمایا کیا تُو نے دیکھا کہ برگشتہ اسرائیل (یعنی سامریہ کی اسرائیلی ریاست) نے کیا کیا؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری (بُت پرستی) کی۔۔۔ اور اس کی بے وفا بہن یہوداہ (یعنی یروشلم کی یہودی ریاست) نے یہ حال دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری (یعنی شرک) کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا) تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری، بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی اور اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زناکاری یعنی (بُت پرستی) کی۔ (باب ۳-آیت ۶-۹)

"یروشلم کے کوچوں میں گشت کرو اور دیکھو اور دریافت کرو اور اس کے چوکوں میں ڈھونڈو، اگر کوئی آدمی وہاں ملے جو انصاف کرنے والا اور سچائی کا طالب ہو تو میں اسے معاف کر دوں گا۔۔۔ میں تجھے کیسے معاف کروں، تیرے فرزندوں نے مجھے چھوڑا اور ان کی قسم کھائی جو خدا نہیں ہیں۔ جب میں نے ان کو سیر کیا تو انہوں نے بدکاری کی اور پرے باندھ کر قحبہ خانوں میں اکٹھے ہوئے۔ وہ پیٹ بھرے گھوڑوں کی مانند ہو گئے۔ ہر ایک صبح کے وقت اپنے پڑوسی کی بیوی پر ہنہنانے لگا۔ خدا فرماتا ہے کیا میں ان باتوں کے لیے سزا نہ دوں گا اور کیا میری روح ایسی قوم سے انتقام نہ لے گی؟" (باب ۵-آیت ۱-۹)

"اے اسرائیل کے گھرانے! دیکھ میں ایک قوم کو دُور سے تجھ پر چڑھا لاؤں گا۔ خداوند فرماتا ہے وہ زبردست قوم ہے۔ وہ قدیم قوم ہے۔ وہ ایسی قوم ہے جس کی زبان تو نہیں جانتا اور اس کی بات کو تُو نہیں سمجھتا۔ ان کے ترکش کھلی قبریں ہیں۔ وہ سب بہادر مرد ہیں۔ وہ تیری فصل کا اناج اور تیری روٹی جو تیرے بیٹوں، بیٹیوں کے کھانے کی تھی کھا جائیں گے۔ تیرے گائے بیل اور تیری بکریوں کو چٹ کر جائیں گے۔ تیرے انگور اور انجیر نگل جائیں گے۔ تیرے مضبوط شہروں کو جن پر تیرا بھروسہ ہے تلوار سے ویران کر دیں گے۔" (باب ۵-آیت ۱۵-۱۷)

"اس قوم کی لاشیں ہوائی پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوں گی اور ان کو کوئی نہ ہنکائے گا۔ میں یہوداہ کے شہروں اور یروشلم کے بازاروں میں خوشی اور شادمانی کی آواز، دولہا اور

دلہن کی آواز موقوف کروں گا کیوں کہ یہ ملک ویران ہو جائے گا۔" (باب ۷۔ آیت ۳۳-۳۴)

"ان کو میرے سامنے سے نکال دے کہ چلے جائیں اور جب وہ پوچھیں کہ ہم کدھر جائیں تو ان سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ جو موت کے لیے ہیں وہ موت کی طرف، جو تلوار کے لیے ہیں وہ تلوار کی طرف اور جو کال کے لیے ہیں وہ کال کو اور جو اسیری کے لیے ہیں وہ اسیری کو۔" (باب ۱۵۔ آیت ۲-۴)

حزقی ایل نبی کا یہود سے خطاب

پھر عین وقت پر حزقی ایل نبی اُٹھے اور انھوں نے یروشلم کو خطاب کر کے کہا:

"اے شہر تو اپنے اندر خونریزی کرتا ہے تاکہ تیرا وقت آ جائے اور تو اپنے لیے بت بناتا ہے تاکہ تجھے ناپاک کریں..... دیکھ اسرائیل کے امرا سب کے سب جو تجھ میں ہیں مقدور بھر خونریزی پر مستعد تھے۔ تیرے اندر انھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا، تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا۔ تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور بیواؤں پر ستم کیا۔ تو نے میری پاک چیزوں کو ناپاک جانا اور میرے سبتوں کو ناپاک کیا۔ تیرے اندر وہ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں۔ تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی۔ تجھ میں انھوں نے اس عورت سے جو ناپاک حالت میں تھی مباشرت کی۔ کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی۔ کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی، اور کسی نے اپنی بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رسوا کیا۔ تیرے اندر انھوں نے خونریزی کے لیے رشوت خوری کی۔ تو نے بیاج اور سود لیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا...... کیا تیرے ہاتھوں میں زور ہو گا، جب میں تیرا معاملہ فیصل کروں گا...... ہاں میں تجھ کو قوموں میں تتر بتر کروں گا اور تیری گندگی تجھ میں سے نابود کر دوں گا اور تو قوموں کے سامنے اپنے آپ میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔" (باب ۲۲۔ آیت ۳-۱۶)

یہ تھیں وہ تنبیہات جو بنی اسرائیل کو پہلے فسادِ عظیم کے موقع پر کی گئیں۔

دوسرے فساد کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کا انتباہ

پھر دوسرے فسادِ عظیم[1] اور اس کے ہولناک نتائج پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو متنبہ کیا۔ متی باب ۲۳

[1] اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ (مرتبین)

میں آنجناب کا ایک مفصل خطبہ درج ہے جس میں وہ اپنی قوم کے شدید اخلاقی زوال پر تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے۔ اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تو نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔" آیت (۳۷-۳۸)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا۔" (باب ۲۴ آیت ۲)

پھر جب رومی حکومت کے اہل کار حضرت مسیحؑ کو صلیب دینے کے لیے جا رہے تھے اور لوگوں کی ایک بھیڑ جس میں عورتیں بھی تھیں، روتی پیٹتی ان کے پیچھے جا رہی تھیں، تو انہوں نے آخری خطاب کرتے ہوئے مجمع سے فرمایا۔

"یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو! وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپا لو۔" (لوقا، باب ۲۳، آیت ۲۸-۳۰) (۵۵)

فصل ۳

یہود کے ایمانی اور اخلاقی بگاڑ پر قرآن کی مزید توضیحات

اس فصل میں جو قرآنی آیات لی گئی ہیں ان میں یہود پر کیے جانے والے تبصرے کا ایک خصوصی تعلق حضور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے، مگر دوسری طرف چونکہ ان میں یہود کے تاریخی بگاڑ کا وضاحت سے ذکر ہے، اس وجہ سے ان آیات کو اس باب میں لایا گیا ہے۔ رہا یہود کا وہ کردار جس کا واقعاتی لحاظ سے حضور کی دعوت اور کام سے براہِ راست تعلق ہے، انہیں صحیح جگہ پر باب ۹ میں لیا گیا ہے۔ (مرتبین)

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (آل عمران - آیت ۹۹)

ترجمہ: "اے نبی کہو، اے اہلِ کتاب! یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔"

یہودی علماء اور درویشوں کی پستیاں

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۗ (التوبہ - آیت ۳۴)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو! ان اہلِ کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں، ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں اور ان کا مرنا جینا اور شادی

اور علم کچھ بھی ان کو بھلائے بغیر نہ ہو سکے، اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکیدار ان کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (۵۶)

یہود میں کثرتِ سوال کی بیماری

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (البقرہ۔ آیت ۱۰۸)

ترجمہ: "پھر کیا اے مسلمانو، تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کیے جا چکے ہیں؟"

یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انہیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ اس معاملے میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی امتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو۔ جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔ (۵۷)

علمِ کتاب اللہ کو مقید کرنے کا جرم

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝

(البقرہ۔ آیت ۱۵۹)

ترجمہ: "جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں درآنحالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے

اس کو ریتیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا اور عامۃ خلائق تو درکنار خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ضلالت اور بدعت کو جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے یا اپنے سکوت سے الہٰی سند جواز عطا کرنے لگے۔ (۵۸)

کلام الٰہی میں تحریف

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۷۵)

ترجمہ: "اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔"

ایک گروہ سے مراد ان کے علماء اور حاملین شریعت ہیں۔ کلام اللہ سے مراد توراۃ، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعے سے پہنچیں۔ "تحریف" کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اس کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیر و تبدل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ علماء بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلام الٰہی میں کی ہیں۔ (۵۹)

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ (البقرہ۔ آیت ۷۹)

ترجمہ: "پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔"

یعنی ان کے علماء نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلام الٰہی کے معنی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں

کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی فلسفہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعۂ کتب مقدسہ (بائیبل) میں جگہ پالی۔ اللہ کا قول (WORD OF GOD) بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔ (۹۰)

تحریف کلمات کی تین صورتیں

مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ (النساء۔ آیت ۴۶)

ترجمہ: "جو لوگ یہودی بن گئے ہیں ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں۔"

یہ نہیں فرمایا کہ یہودی ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ "یہودی بن گئے ہیں" کیونکہ ابتداً وہ بھی مسلمان ہی تھے جس طرح ہر نبی کی اُمت اصل میں مسلمان ہوتی ہے مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دینے کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں رد و بدل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقہ سے روایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔ (۹۱)

کلام اللہ میں اُلٹ پھیر

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ (آل عمران۔ آیت ۷۸)

ترجمہ: "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔"

اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ

یا فقرے کو جوان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔(۹۳)

یہود تورات کا تحفظ نہ کر سکے

عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائیبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں، اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلام الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائیبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے۔ اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیل اربعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

اصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیئے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھ کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی، اور بنی اسرائیل اس کو "توریت" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو ۲۔ سلاطین باب ۲۲۔ آیت ۸ تا ۱۳)

یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے ہاں طاق نسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت ہی تھوڑی تعداد میں تھے ہمیشہ کے لیے گم کر دیئے۔ پھر جب عزرا کاہن (عُزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے

بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی جو بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی خروج، احبار، گنتی اور استثنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں۔ پس دراصل اب تورات ان منتشر اجزا کا نام ہے جو سیرت موسیٰ کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرت موسیٰ کا مصنف کہتا ہے "خدا نے موسیٰ سے یہ فرمایا" یا "موسیٰ نے کہا خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے" وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر۔ تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزاء میں کہاں کہاں تفسیری اور تشریحی اضافے کر دیے گئے ہیں۔ (۶۳)

عقیدہ آخرت میں خرابی

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۴۸)

ترجمہ: "اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔"

بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آگئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالات خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ انہی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے۔ (۶۴)

اُخروی نجات کے متعلق زعم اجارہ داری

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (البقرہ - آیت ۶۲)

ترجمہ: "یقین جانو کہ نبی عربیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

سلسلہ عبارت کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور اعتقادات کے لحاظ سے کیسا ہی ہو بہرحال نجات اس کے لیے مقرر ہے اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمہاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہوگا نہ کہ تمہاری مردم شماری کے رجسٹروں پر۔ (۶۵)

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ (البقرہ - آیت ۹۴)

ترجمہ: "ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔"

یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے، ان کی دنیا پرستی پر۔ جن لوگوں کو واقعی دارِ آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔ (۶۶)

ان کا ایک گروہ آخرت کا منکر تھا

وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوٓا أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے (یعنی اصحاب کہف کے) حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی۔

سریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں وہاں قیامت اور آخرت کے مسئلے پر زور و شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا لیکن ابھی تک رومی شرک اور بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات طاقت ور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ افسس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی، اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اس کے مقابلے میں مضبوط دلائل نہ تھے۔ متی، مرقس اور لوقا تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں (ملاحظہ ہو متی باب ۲۲۔ آیت ۲۳-۳۳، مرقس باب ۱۲۔ آیت ۱۸-۲۷، لوقا باب ۲۰۔ آیت ۲۷-۴۰) اسی وجہ سے منکرین آخرت کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنین آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اسی وقت اصحاب کہف کے بعث کا واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابل انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔ (۶۴)

بدعملی کے باوجود اُخروی کامرانی کا عقیدہ

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (آل عمران۔ آیت ۷۷)

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں

کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے۔ انہی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی۔ اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں دھو ڈالا جائے گا۔ حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

آخرت میں انہیں سزا ہوئی بھی تو معمولی ہوگی

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۔ (البقرہ۔ آیت ۸۰)

ترجمہ: "وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے، تو مل جائے۔"

یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے جس میں ان کے عامی اور عالم سب مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں، لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے، اور بالفرض ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔ (۶۸)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔ (آل عمران۔ آیت ۲۴)

ترجمہ: "ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتشِ دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز۔ ان کے خودساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔"

یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال جنت ہماری ہے۔ ہم اہلِ ایمان ہیں۔ ہم فلاں کی اولاد اور فلاں کی امت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں۔ بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے۔ پھر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے

ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کھلم کھلا حق سے انحراف کرتے ہیں، اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔ (۶۹)

عوام علم سے محروم اور مفروضات میں مگن تھے

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

(البقرہ۔ آیت ۷۸)

ترجمہ: "ان میں ایک دوسرا گروہ امّیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔"

یہ ان کے عوام کا حال تھا۔ علم کتاب سے کورے تھے کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اصول بتائے ہیں اور شرع کے کیا قواعد سکھلائے ہیں اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور جھوٹی توقعات پر جی رہے تھے۔ (۷۰)

خدا کے چہیتے فرزند

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ (المائدہ۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو، پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔"

تَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ (المائدہ۔ ۸۰)

ترجمہ: "آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کفار کی حمایت اور رفاقت کرتے ہیں یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لیے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔"

غیر یہودیوں سے جو سلوک چاہیں کریں

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آل عمران۔ آیت ۷۵)

ترجمہ: "ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں امیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔"

یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا بلکہ ان کے ہاں کی مذہبی تعلیم بھی یہی کچھ تھی اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔ بائبل قرض اور سود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے (استثناء ۱۵: ۱-۳، ۲۳: ۲۰) تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے۔ غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ ربی شماعیل کہتا ہے کہ اگر امتی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور اگر امتیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا تھا تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(تالمودک مسلیتنی، پال آئزک ہرشن، لندن ۱۸۸۰ء صفحات ۳۷، ۲۱۰، ۲۲۱) (۷۱)

ان کی اکثریت کا بگاڑ

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (المائدہ۔ آیت ۸۱)

ترجمہ: "اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے۔ مگر ان میں سے بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں فطرتاً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں مگر

بہرحال اُنھی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہیں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کُھلم کُھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرینِ نبوت کے ساتھ ہیں" اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔ (۴۲)

یہودیوں کا اچھا عنصر

لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (آل عمران۔ آیت ۱۱۳۔۱۱۴)

ترجمہ: "سارے اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائیوں کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں، یہ صالح لوگ ہیں۔"

ضابطۂ سبت میں نقب زنی

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ (الاعراف۔ آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)

ترجمہ: "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی۔ انھیں یاد دلاؤ وہ

وہ واقعہ کہ وہاں لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے، تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔ آخرکار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار۔؎

محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ، یا ایلات یا ایلوت تھا جس کی جگہ آج کل عقبہ کی مشہور بندرگاہ واقع ہے۔ اسی کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بحر قلزم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔

جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کی کتب مقدسہ میں کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا۔ اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں۔ مگر قرآن مجید میں جس انداز سے اس واقعہ کو یہاں اور سورہ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعہ سے خوب واقف تھے اور یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

"سبت" ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولاد اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ

اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانے میں (جو ۶۲۸ اور ۵۸۶ قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) اخاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال اسباب لے لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا۔ (یرمیاہ ۱۷، ۲۱، ۲۷) ایسی ہی شکایت حزقی ایل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۰ اور ۵۳۶ ق م کے درمیان گزرا ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حزقی ایل ۲۰، ۱۲ تا ۲۴) ان حوالوں سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے وہ بھی غالباً اسی دور کا واقعہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی طرف میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغدار کرنا چاہتا ہے اس سے وہ صرف اس حیلے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اسے میسر نہ رہے ہوں۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک وہ جو دھڑلے سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے، دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے، مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل۔ تیسرے وہ جن کی غیرت ایمانی حدود اللہ کی کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کے حکم اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہ راست پر آ جائیں، اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی برأت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورت حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا، کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی برأت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک

مبتلائے عذاب ہوں گے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے، لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا۔ بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا پہلا خیال ہی ٹھیک تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا تو لا محالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً "ڈرو اس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو۔" اور اس کی تشریح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ "یعنی اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہارِ ناراضی نہ کریں۔ پس جب

لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس (سخت عذاب) فرمایا گیا اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ إِنْ أَصَبْتُ فَمِنَ اللّٰهِ وَإِنْ أَخْطَأْتُ فَمِنْ نَفْسِي، وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔

قتل انبیاء کا جرم

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۶۱)

ترجمہ: "ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔"

ان آیات کی رو سے ان کے کفر کی مختلف صورتیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات و خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشاد الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جانتے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

رہا انبیاء کا قتل، تو بنی اسرائیل نے اپنے اس جرم کو اپنی تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائیبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت

لے ڈوبا تھی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔" (۲-تواریخ باب ۱۶- آیت ۷-۱۰)

۲- "حضرت الیاس (ایلیاہ) علیہ السلام نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سر نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا حتیٰ کہ ان کو جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاسؑ نے مانگی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان کے درپے ہیں۔" (۱-سلاطین۔ باب ۱۹- آیت ۱-۱۰)

۳- "ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔" (۱-سلاطین۔ باب ۲۲- آیت ۲۶-۲۷)

۴- پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور ذکریاہ نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲-تواریخ۔ باب ۲۴- آیت ۲۱)

۵- اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی حکومت اشوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان تلا کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اٹھے اور کوچے کوچے انہوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہو گا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیے گئے، رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں، اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔

(یرمیاہ، باب ۱۵- آیت ۱۰- باب ۱۸، آیت ۲۰-۲۳- باب ۲۰، آیت ۱-۱۸- باب ۳۶ تا باب ۴۰)

۶- ایک اور نبی عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا

تم ملک یہوداہ سے باہر نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔" (عاموس، باب ۷۔ آیت ۱۰-۱۳)

۷۔ حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام نے جب ان بد اخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں علانیہ ہو رہی تھیں تو پہلے وہ قید کیے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔

(مرقس ۳، باب ۶۔ آیت ۱۷-۲۹)

۸۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا کیونکہ وہ انہیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان اور راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا، اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور برابا ڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی باب ۲۷۔ آیت ۲۰-۲۶)

یہود کی طرف سے قتل انبیاء کا اقرار

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (النساء۔ آیت ۱۵۷)

ترجمہ: "اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔"

یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور گہوارے میں ان کے کلام کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انہوں نے حضرت موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آل عمران رکوع ۵ میں آیا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آں جناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اسے قتل کر دے

مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو ان کی برائیوں پر ان کو ٹوکے اور ناجائز کام سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تلمود نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک دیوار پر اسے تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟ انہوں نے جواب دیا "یہاں زکریا نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آگئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔" بائیبل میں یرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بداخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یرمیاہ نے ان کو متنبہ کیا کہ اگر ان اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کلدانیوں) سے ملا ہوا ہے اور قوم کا غدار ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آچکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انہوں نے ہیرودیس (والیٔ ریاست یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے اور پھر والیٔ ریاست کی معشوقہ کے مطالبہ پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زعم میں مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو "ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے"۔ (۵۵)

باب ۴

جنگ کے متعلق یہودیوں کے نظریات

فصل ا

اُن کے مذہب کی رُو سے اُن کا

مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ

یہودی مذہب کی تحقیق میں ہم کو وہ دقتیں پیش نہیں آتیں جو ہندو مذہب کے قوانین تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں۔ صرف ایک کتاب تورات کو لے کر ہم اس مذہب کی تعلیم اور اس کے احکام و قوانین معلوم کر سکتے ہیں اور اسی میں یہودیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ متاخرین علمائے یہود نے شریعت یہود کے قوانین کو مرتب کرنے کے لیے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو جزئیات کی تفصیل پر حاوی ہیں، مثلاً یہودا بن یوسف کی مشناہ اور یروشلمی جو دوسری صدی عیسوی کی تصنیفیں ہیں، اور تالمود جو مشناہ اور گمارا کو ملا کر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کی گئی، اور اسحاق الفاسی کی ہالاخوث جو گیارہویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی اور تالمودی قوانین کی بہترین شرح بھی جاتی ہے، اور موسیٰ میمونی کی مشنہ تورات جو بارہویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی اور یعقوب بن اشر کی طور جو چودھویں صدی کی یادگار ہے اور یوسف قارو کی شولحان اروخ جو سولہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور جس میں یہودی احکام و معاملات کے سارے احکام روایاتِ قدیمہ کے مطابق مرتب کیے گئے ہیں لیکن ہمارے لیے ان کتابوں سے احتجاج چنداں مفید نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو یہودیوں کے تمام فرقوں میں متفق علیہ ہو، اور نہ کسی کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے یہودی مذہب کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہودیوں نے ان کتابوں سے بیزاری ظاہر کی ہے اور توراۃ کے سوا سب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۰۸ء میں ربیون امریکہ کی مرکزی کانفرنس کا جو اجتماع انڈیاناپولس میں ہوا تھا اس نے مذہبی ضوابط کی ہمہ گیری کے خلاف علانیہ اظہارِ بغاوت کر دیا تھا۔ لہٰذا ہمیں ان سب کتابوں کو نظر انداز کر کے مسئلہ جنگ میں صرف توراۃ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔؎

؎ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ تورات کے متعلق ہم جو کچھ کہیں گے وہ اس تورات کے متعلق نہیں ہوگا جو حضرت موسیٰ

مقصدِ جنگ

تورات میں بہ نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے، اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر سوائے اس ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس تورات کے متعلق ہوگا جو آج عہد عتیق Old Testament کے نام سے دنیا میں موجود ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ عہد عتیق کی کتب خمسہ Pentrate UCH اصل تورات نہیں ہیں۔ اصل تورات دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود "عہد عتیق" سے ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوعؑ کی مدد سے تورات کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا (استثنا، ۳۱: ۲۴-۲۶) ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد شریعت موسویہ کے مجتہدین نے مرتب کی تھیں۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عزیرؑ نے بائیبل کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے ان کتابوں کو از سر نو مرتب کیا (اپوکریفا، جزو دوم باب چہاردہم) مگر حوادثِ زمانہ نے اس نئے نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندر اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ اس کے علوم و آداب کو بھی مشرق ادنیٰ پر پھیلا گیا تو اسی عہد میں تورات کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یونانی ترجمہ رائج ہو گیا۔ پس آج جو تورات ہمارے سامنے ہے اس کی سند کسی طرح حضرت موسیٰؑ تک نہیں پہنچتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ توراۃ میں اصلی توراۃ کا کوئی جزو بھی شامل نہیں، یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس توراۃ میں اصل توراۃ کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مل گئی ہیں، اور بعید نہیں کہ اس کی بعض چیزیں اس میں سے غائب بھی ہو گئی ہوں۔ آج جو شخص بھی منتقدانہ نظر سے اس کتاب کو پڑھے گا وہ صریح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ اس میں خدا کے کلام کے ساتھ یہودی علماء کی تفسیریں، بنی اسرائیل کی قومی تاریخ، اسرائیلی فقہاء کے قانونی اجتہادات اور دوسری بہت سی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنہیں الگ کر کے کلام الٰہی کو چھانٹ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے تورات کا دین وہی تھا جو خود قرآن کا دین ہے اور موسیٰ علیہ السلام اسی طرح اسلام کے پیغامبر تھے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بنی اسرائیل ابتدا میں اسی دین کے پیرو تھے مگر بعد میں انہوں نے اصل دین میں اپنی خواہشات کے مطابق بہت کچھ کمی بیشی کر کے ایک نیا مذہبی نظام یہودیت کے نام سے بنا لیا۔ لہٰذا یہاں جس چیز پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ یہی یہودیت ہے نہ کہ وہ دین جو حضرت موسیٰؑ لائے تھے۔ (۷۷)

مقصد کے بجز استثناء (باب ۲، اور اعداد (گنتی) باب ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی اور مقصد کا نشان ہم کو نہیں ملتا۔ یہ مقصد کتاب استثناء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"اور خداوند نے موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا:

بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انہیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو، اور وہاں آپ بسو، کیونکہ وہ سرزمین میں نے تم کو دی ہے کہ اس کے مالک ہو۔" (۳۳: ۵۰-۵۴)

بلکہ کتاب استثناء میں ہے:

"سو تم اٹھو کوچ کرو، اور ارنون کی وادی کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے، سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس سے کا مقابلہ کر" (۲: ۲۴)

"لیکن حسبون کے بادشاہ سیحون نے ہم کو اپنے ہاں سے گزرنے نہیں دیا کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا، اور اس کے دل کو سخت، تاکہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے۔ پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھ میں نے سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا، تو میراث لینا شروع کر، تاکہ اس کی زمین کا وارث ہو جائے۔ تب سیحون یہص میں ہمارے مقابلے کے لیے نکلا، وہ اور اس کی ساری قوم، تاکہ ہم سے لڑے۔ تو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالے کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (یعنی قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، سوا چارپایوں کے جنہیں ہم نے اپنے لیے غنیمت جان کر پکڑا اور اس مال کے سوا جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا۔" (۲: ۳۰-۳۵)

تب ہم پھر سے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے اور بسن کا بادشاہ عوج اور عی میں وہ اور اس کی ساری

قوم ہمارے مقابلے کے لیے نکل آیا کہ ہم سے لڑے اور خداوند نے اس وقت مجھ سے فرمایا: اس سے مت ڈر کہ میں اس کو اور اس کی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت تیرے قبضے میں کر دوں گا تو اس سے وہی کرے گا جو تو نے اموریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا کیا۔ چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو میں کر دیا اور ہم نے انہیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لیے .... اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں حسبون کے بادشاہ سیحون کی طرح حرم کیا۔ لیکن سارے چوپایوں اور شہروں اور مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔" (۳ : ۱-۷)

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا، اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے اموال و املاک اور ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے اور اس کے نزدیک یہی قہر و تسلط اس وراثت ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں بھی "وراثت ارضی" کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے۔

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الانبیاء - ۱۰۵)

ترجمہ: "زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف - ۱۲۸)

ترجمہ: "زمین خدا کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے اور انجام کار کامیابی صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے۔"

لیکن اس وراثت کا تخیل توراۃ کے تخیل سے بالکل مختلف ہے۔ توراۃ زمین کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دیتی ہے۔ جیسا کہ اعداد (۳۳ : ۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ مگر قرآن اسے کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے۔ توراۃ میں وراثت ارضی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ملک و مال اور جان و آبرو کی مالک بن جائے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیے جانے

کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کے باعث ناکارہ ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو جو اس سے بہتر اور اصلح ہو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر توراۃ میں میراثِ زمین حاصل کرنے کے لیے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں ملک تمہاری قومی میراث ہے لہٰذا تم اس کو لڑ کر فتح کر لو۔ یہی توراۃ کی "وراثت ارضی" کھلی کھلی ملک گیری ہے۔ اسلام کے جہاد فی سبیل اللہ کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔

حدودِ جنگ

جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہم کو تورات میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے پیروؤں کو دشمن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے لیے ذیل کے احکام قابلِ مطالعہ ہیں۔ کتاب استثناء میں ہے:

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے آ پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے اور دروازے تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دے دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو۔" (۲۰ : ۱۰-۱۴)

"جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو، مدت تک محاصرہ کیے رہو تو تبر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے۔ سو تو انہیں محاصرہ کے کام میں لانے کے لیے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں۔"

(۲۰ - ۱۹)

"لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔"

(۲۰ : ۱۶-۱۷)

"اور جب خداوند تیرا خدا اُنہیں تیرے حوالے کر دے تو تُو اُنہیں ماریو اور حرم کیجیو۔ نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ اُن پر رحم کریو۔ تم اُن کے مذبحوں کو ڈھا دو، اُن کے بتوں کو ڈھا دو، اُن کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور اُن کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو" (۷ : ۲-۵)

"تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہو گے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے، اُونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے نیست و نابود کر دیجیو، ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو، اور ان کے ستونوں کو توڑ دیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو، اور ان کے معبودوں کی گھڑی ہوئی مورتوں کو چکناچور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو" (۲ : ۱۲) کتاب خروج میں ہے:

"آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے ہانکتا ہوں۔ ہوشیار رہ تا نہ ہو کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھ لیوے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے درمیان پھندا ہو۔ بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالو" (۳۴ : ۱۱ تا ۱۳)

کتاب اعداد میں ہے:

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اس کے اپنی قوم کے لوگوں سے مل جائے گا۔ تب موسیٰؑ نے لوگوں کو فرمایا کہ بعض تم میں سے لڑائی کے لیے تیار ہوں...... سو ہزاروں بنی اسرائیل میں سے ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہو گئے۔ یہ سب لڑائی کے لیے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے.... اور انہوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰؑ سے فرمایا تھا اور سارے مردوں کو قتل کیا..... اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے، اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا، اور انہوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لیے، اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰؑ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، موآب کے میدانوں

میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے لائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سوار تھے، اور ان پر جو سیکڑوں کے سردار تھے جو جنگ کر کے پھرے تھے، خفا ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟۔۔۔۔۔۔ سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کر دو اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے مارو لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔"

کتاب یشوع میں ہے:۔

"اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا، کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہ تیغ کر کے حرم کیا۔۔۔۔۔ پھر انہوں نے شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا، مگر روپا اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کیے۔" (۶: ۲۱-۲۵)

"اور انہوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے اور ایسا ہوا کہ جب بنی اسرائیل سب کو ان بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا عی کے لوگوں کو قتل کر چکے اور وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے، تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا۔ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے یعنی عی کے سب لوگ۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا، جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم نہ کر لیا نہ کھینچا۔ اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے لیے لوٹا، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا۔" (۸: ۲۳-۲۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنہیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے۔ دوسرے وہ جنہیں اس نے ان کی میراث میں دیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لیے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انہیں صلح کا پیغام دیا جائے، اور اگر وہ اسے قبول کر کے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کر دیں تو ان کو باجگذار اور خدمت گزار بنا لیا جائے۔ لیکن اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں

کو غلام بنا لیا جائے، اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا جائے۔ دورانِ جنگ میں باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس لیے نہیں کہ ایک مفسدانہ فعل ہے، بلکہ اس لیے کہ انہیں اس طرح خراب کر دینے سے فتح حاصل کرنے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام حقوق اور رعایات سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے، ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے، ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ان کی کھیتیاں اور باغات اور عمارتیں اور عبادت گاہیں تہس نہس کر دی جائیں، ان کی عورتیں، مرد، بچے، حتیٰ کہ جانور تک تہ تیغ کر دیے جائیں، اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ اس جنگ کی غایت صرف یہ قرار دی گئی ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیۃً نیست و نابود کر دی جائیں۔ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش کی ہی نہیں گئی جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جاں بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کر رہی ہے۔ اس کا بہترین عملی تبصرہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست ہے جو اس میراثِ ارضی کے تخیل پر قائم ہوئی اور اس بیسویں صدی میں اس نے عربوں کے ساتھ وہی کچھ کر کے دکھا دیا جس کی ہدایت بائیبل میں دی گئی تھی۔ (۷۸)

باب ۵

حضرت موسیٰؑ سے حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ تک کا دور

فصل ۱۱

یہود کا مطالبۂ بادشاہت اور اس کے نتائج

سموئیل نبی سے بادشاہت کے تقرر کا تقاضا

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا (البقرہ - ۲۴۶)

ترجمہ: "پھر تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰؑ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انہوں نے اپنے نبی سے کہا، ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جب کہ ہم کو اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا سب پیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔"

یہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیحؑ کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انہوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے۔ مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے سرداران بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سربراہ کار ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آ چکی تھی، اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق ان کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلے میں بائبل کی کتاب سموئیل اول میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا..... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے..... یہ بات سموئیل کو بری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں تو اس کو مان کیونکہ انہوں نے تیری نہیں بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں ان کا بادشاہ نہ رہوں....."

سموئیل نبی کا انتباہ

"اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا، اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا۔ اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا۔ اور تمہارے نوکر چاکروں اور اور لونڈیوں اور تمہارے شکیل جوانوں اور تمہارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا۔ اور وہ تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے، اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا، فریاد کرو گے پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے، ہمارے آگے آگے چلے، ہماری طرف سے لڑائی کرے...... خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو ان کی بات مان لے اور ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دے۔"

(باب ۷۔ آیت ۱۵ تا باب ۸۔ آیت ۲۲)

خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر کر دیا گیا

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا۔۔۔ جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے، حالانکہ خداوند تمہارا خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور تمہارا بادشاہ بھی، جو تم پر سلطنت کرتا ہے، خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو، بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو، تو خداوند کا ہاتھ تمہارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمہارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور تم جان لوگے اور دیکھ بھی لوگے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے سے کتنی بڑی شرارت کی۔۔۔۔ اب رہا میں سو خدا نہ کرے کہ تمہارے لیے دعا کرنے سے باز آ کر خداوند کا گنہگار ٹھہروں، بلکہ میں وہی راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تم کو بتاؤں گا۔" (باب ۱۲۔ آیت ۲ تا ۲۳) ۱؎

قرآن کا بیان

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرہ۔ آیت ۲۴۷)

۱؎ کتاب سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں اس مقام پر سرداران بنی اسرائیل کے اس مطالبے کی مذمت کیوں نہیں کی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصے کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا غلط تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بزدل ہو گئے تھے، اور ان میں کس قدر نفسانیت آگئی تھی اور ان کے اندر اخلاقی انضباط کی کتنی کمی تھی، جس کے سبب سے آخر کار وہ گر گئے اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔ (مؤلف) (۲۹)

ترجمہ: "ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے، ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔ نبی نے جواب دیا کہ تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا گیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

بائبل میں طالوت کا نام ساؤل لکھا ہے یہ قبیلہ بن یمین کا ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ "بنی اسرائیل میں اس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا، اور وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔" اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اسے اپنے گھر لائے، تیل کی کپی لے کر اس کے سر پر انڈیلی اور اسے چوما اور کہا کہ "خداوند نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔" اس کے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۸۰)

(۱۔ سموئیل، باب ۱۰۔۹)

تابوت سکینہ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (البقرۃ۔ آیت ۲۴۸)

ترجمہ: "اس کے ساتھ ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر

لہ یہ بنی اسرائیل میں دوسرا شخص تھا جس کو خدا کے حکم سے "مسیح" کر کے پیشوائی کے منصب پر مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے حضرت ہارون سردار کاہن کی حیثیت سے مسح کیے گئے تھے۔ اس کے بعد تیسرے ممسوح یا مسیح حضرت داؤد علیہ السلام ہوئے اور چوتھے مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ لیکن طالوت کے متعلق ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں نہیں ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہی کے لیے نامزد کیا جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اسے نبی تسلیم کیا جائے۔ (مؤلف)

ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جس کو اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔"

بائیبل کا بیان قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً "عہد کا صندوق" کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فلسطینی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ مشرکوں کے جس شہر اور جس بستی میں بھی رکھا گیا، وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ آخرکار انہوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی میں رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملے کی طرف قرآن ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس صندوق میں تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، تو بائیبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آگئے ہیں۔ پس اس صندوق کا واپس آنا اس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات، جو اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے، ان سے مراد وہ پتھر کی تختیاں ہیں جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا جسے حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں مَن بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا اور غالباً حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔ (۸۱)

واقعۂ نہر میں ان کی بے صبری کی مثال

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ

شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۔ (البقرہ ۔ آیت ۲۴۹)

ترجمہ: "پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا، تو اُس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے، ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے، تو پی لے۔ مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔"

ممکن ہے اس سے مراد دریائے اُردن ہو یا کوئی اور ندی یا نالہ۔ طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر اس کے پار اترنا چاہتا تھا مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے، اس لیے اُس نے کار آمد اور ناکارہ لوگوں کو تمیز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں، ان پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس دشمن کے مقابلے میں پامردی دکھائیں گے جس سے پہلے ہی وہ شکست کھا چکے ہیں۔ (۸۲)

اسرائیلیوں کا جالوت پر غالب آنا

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ڐ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ

(البقرہ آیات ۲۴۹ ۔ ۲۵۱)

ترجمہ: "پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے۔ انہوں نے کہا: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے حکم سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا

ساتھی ہے اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے، تو انھوں نے دعا کی :-
اے ہمارے رب ! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔ آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کو چاہا اس کو علم دیا۔"

حضرت داؤدؑ کی بہادری

حضرت داؤد علیہ السلام اُس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اُس وقت پہنچے جب کہ فلسطیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان جالوت (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤد یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اُس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعے سے انہیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ طالوت نے اُن سے اپنی بیٹی بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سموئیل اول۔ باب ۱۷) (۸۴)

فصل ۲

غلبۂ فلسطین سے حملۂ بخت نصر تک

(اس دور کا مجموعی جائزہ)

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل۔ آیت ۵)

ترجمہ:۔ "آخرکار جب اُن میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اُٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔"

اس سے مراد وہ ہولناک تباہی ہے جو آشوریوں اور اہلِ بابل کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر نازل ہوئی۔ اس کا تاریخی پس منظر سمجھنے کے لیے ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ ایک طالب علم کے سامنے وہ تمام اسباب آجائیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک حامل کتاب قوم کو امامت اقوام کے منصب سے گرا کر ایک شکست خوردہ، غلام اور سخت پسماندہ قوم بنا کر رکھ دیا۔

فلسطین میں یہود کا ابتدائی دور

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حِتّی، اَمُوری، کنعانی، فِرِزّی، حِوّی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام "ایل" تھا جسے یہ دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشیرہ تھا۔ اور اس سے خداؤں اور خدانیوں کی پوری نسل چلی تھی جس کی تعداد ۷۰ تک پہنچتی تھی۔ اس کی اولاد میں سب سے زبردست بَعل تھا جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اُناث کہلاتی تھی اور فلسطین میں عستارات۔ یہ دونوں

خواتینِ عشق اور افزائشِ نسل کی دیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا، کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی، کسی دیوتا کو وبائیں اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے، اور یوں ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف اور اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے بہت بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں۔ وہ اخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو آثار آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں وہ شدید اخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زناکاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاری کرنا عبادت کے اجزاء میں داخل تھا اور اسی طرح کی اور بہت سی بداخلاقیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

ہدایت کو فراموش کر دیا

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انھوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقت ور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انھیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل مسخر نہ کر سکے۔

پہلا خمیازہ

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا، اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت بائیبل کی کتاب قضاۃ میں یوں کی گئی ہے:

"اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے۔ اور انہوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انہیں ملک مصر سے نکال کر لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے گرداگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے، پیروی کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ وہ خداوند کو چھوڑ کر عستارات کی پرستش کرنے لگے، اور خداوند کا قہر اسرائیل پر"

قضاۃ (باب ۲۔ آیت ۱۱-۱۴)

دوسرا خمیازہ

اس کے بعد دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں انہوں نے اور فلسطینیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے درپے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا حتیٰ کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے ۱۰۲۰ ق م میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ ق م) حضرت داؤد علیہ السلام (۱۰۰۴ تا ۹۶۵ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م)۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شمالی ساحل پر فنیقیوں کی اور جنوبی ساحل پر فلسطیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنہیں مسخر نہ کیا جا سکا اور محض باجگزار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔

یہودی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں سلطنت اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخرکار سامریہ قرار پایا اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اوّل روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی

فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اور یہ حالت اس وقت تک انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرمانروا اخی اب نے صیدا کی مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کر لی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع سے شرک اور بداخلاقیاں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔

ریاست سامریہ پر کیا گزری

اس دور میں عاموس نبی (۷۸۷ تا ۷۴۷ ق م) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ ق م) نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں۔ مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے، وہ تنبیہ کی تلخی سے اور زیادہ تیز ہو گیا یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولت سامریہ کی حدود میں اپنی نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

یہودیہ پر بخت نصر کا تباہ کن حملہ

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی لیکن نسبتاً اس کا اخلاقی زوال دولت اسرائیل کی بہ نسبت سست رفتار تھا، اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ دولت اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی بلکہ صرف باجگزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب

۱؎ ان کی اصلاحی اور انتہائی کوششوں کی تفصیل اگلی فصل میں دی جا رہی ہے۔ (مرتبین)

حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۹ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا۔ اور یہودیہ کا بادشاہ اسی کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی بند نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا، اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا۔ اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اس کی پاداش میں ان کو دی گئی۔ (۹۸۴)

فصل ۳

حضرت الیاسؑ کی اصلاحی اور انتباہی مساعی

بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ (الصّٰفّٰت۔ آیت ۱۲۹)

ترجمہ:۔ "اور الیاسؑ کا ذکر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔"

حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جو کچھ ستایا اس کی داستان اوپر گزر چکی ہے مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کم ہی لوگوں کو انھوں نے ان سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہوگا۔ ان کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاسؑ علیہ السلام ایک بگولے میں آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں۔ (۲۔ سلاطین۔ باب دوم) اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے چنانچہ بائیبل کی کتاب ملاکی میں لکھا ہے ۔[1]

"دیکھو، خدا کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پہلے میں ایلیاہ نبی کو تمھارے پاس بھیجوں گا۔" (۴:۵)

---

[1] حضرت یحییٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانہ میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاسؑ، دوسرے مسیحؑ، تیسرے "وہ نبی" (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰ کی نبوت شروع ہوئی تو انھوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیحؑ ہو؟ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم ایلیاہ (الیاسؑ) ہو؟ انھوں نے کہا نہیں پھر پوچھا کیا تم "وہ نبی" ہو؟ انھوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں، تب انھوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیاہ ہو اور نہ "وہ نبی" ہو تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یوحنا ۱:۱۹:۲۶) پھر کچھ مدت بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غلغلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیاہ نبی (یعنی حضرت الیاس) آگئے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِی الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت۔ آیات ۱۲۳ تا ۱۳۲)

ترجمہ: " اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباؤ اجداد کا رب ہے"۔ مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا سو اب یقیناً سزا کے لیے پیش کئے جانے والے ہیں۔ بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔ اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ سلام ہے اِل یاسین پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔

حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہی مقام اور دوسرا سورۃ انعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ء اور ۸۵۰ء ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جلعاد کے رہنے والے تھے۔ قدیم زمانے میں جلعاد اس علاقے کو کہتے تھے، جو آج کل موجودہ ریاست اُردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے)۔ بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تشبی (ELIAH TISHBITE) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں۔

بائبل میں حضرت الیاسؑ کا تذکرہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رحُبعام (REHOBAAM) کی نااہلی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہیں۔ (مرقس ۶: ۱۴، ۱۵) خود حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیاہ نبی آنے والے ہیں مگر حضرت مسیحؑ نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ "ایلیاہ تو آ چکا اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا"۔ اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاسؑ (متی ۱۱: ۱۴ اور متی ۱۷: ۱۰: ۱۳) ۸۵

سکے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا، اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دگرگوں تھے لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی اور ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اخی اب (AHAB) نے صیدا (موجودہ لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (JEZEBAL) سے شادی کر لی تو فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آکر اخی اب خود بھی مشرک ہو گیا۔ اس نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بعل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

حضرت الیاسؑ کی دعوت، انتباہ اور معجزات

یہی زمانہ تھا جب الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جلعاد سے آکر اخی اب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں گرے گا حتیٰ کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف درست ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخر کار اخی اب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاس علیہ السلام کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انھوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ ربّ العالمین اور بعل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ایک مجمع عام میں بعل کے پجاری بھی آکر اپنے معبود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ ربّ العالمین کے نام قربانی کروں گا، دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھ سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے، اس کے معبود کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہ کرمل (CARMEL) پر بعل کے ساڑھے آٹھ سو پجاری جمع ہوئے۔ اور اسرائیلیوں کے مجمع عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بعل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاسؑ نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بعل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے۔

جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے اسی مجمع عام میں بعل کے پجاریوں کو قتل کرا دیا اور پھر بارش کے لیے دُعا کی جو فوراً قبول ہُوئی۔ یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

حضرت الیاسؑ کو ملک بدر کر دیا گیا

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اخی اب اپنی بُت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی ایزبل حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی۔ اور اس نے قسم کھا لی کہ جس طرح بعل کے پجاری قتل کیے گئے ہیں، اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان حالات میں حضرت الیاس علیہ السلام کو ملک چھوڑنا پڑا، اور چند سال تک وہ کوہ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی، اسے بائیبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھایا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا۔ اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔"

(سلاطین۔ ۱۹ : ۱۰)

یہودیہ میں حضرت الیاسؑ کی دعوتی مہم

اسی زمانہ میں بیت المقدس کی یہودی ریاست کے فرمانروا یہورام (JEHO RAM) نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب کی بیٹی سے شادی کر لی اور مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہُوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ بائیبل میں نقل ہُوئے ہیں:

"خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے: اس لیے کہ تو نہ اپنے باپ یہوسفط کی راہوں پر چلا اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا، بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہوں پر چلا ہے اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زناکار بنایا جیسا اخی اب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے، قتل بھی کیا، سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہو جائے گا یہاں تک

کہ تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی۔" (۲۔ تواریخ ۲۱: ۱۲-۱۵)

حضرت الیاسؑ کی پیشینگوئی پوری ہو کے رہی

اس خط میں حضرت الیاسؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پُورا ہُوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو پکڑ کر لے گئے۔ پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہُوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاسؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے اخی اب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخر حضرت کی بد دعا سے اخی اب کا گھرانہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائیبل کے حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ سلاطین، باب ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۱۔ ۲۔ سلاطین باب ۱-۲۔ تواریخ باب ۱۲۔ (۸۹)

یہودیوں کا دیوتا "بعل"

بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا۔ اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سُورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سُورۂ النساء آیت ۱۲۷، سُورۂ ہُود آیت ۷۲، اور سُورۂ نُور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں۔ اور انھوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فینیقی قوم (PHOENICIANS) کا سب سے بڑا نر دیوتا بعل تھا۔ اور اس کی بیوی عستارات (ASHTORETH) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سُورج ہے یا مشتری، اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابِل سے لے کر مصر تک پُورے مشرقِ اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہُوئی تھی، اور خصوصاً لبنان اور فلسطین و شام کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردن میں آ کر آباد ہوئے، اور تورات کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے، تو ان کے اندر

بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اول حضرت ت کے بعد ہی۔ اسرائیل میں بداخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے .... اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضاۃ ۲ : ۱۱-۱۲)

”سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حتیوں اور اموریوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضاۃ ۳ : ۵-۶)

اس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے دن ایک مجمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا (قضاۃ ۶ : ۲۵-۳۲)

اس صورت حال کو آخر کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی، بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر ابھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہہ گئی۔ (۸۷)

فصل ۴

دورِ داؤدی و سلیمانی میں یہود کا عروج

حضرت داؤدؑ کے دور میں فولادی صنعت

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۔ (الانبیاء ۔ آیت ۸۰)

ترجمہ :۔ "اور ہم نے تمہارے فائدے کے لیے اس کو زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے ۔ پھر کیا تم شکر گزار ہو؟"

سورۂ سبا میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے :۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (آیت ۱۱)

ترجمہ :۔ "اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔

لوہے کے استعمال کا دور جدید تحقیقات کی روشنی میں

موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دور (IRON AGE) سنہ ۱۲۰۰ اور سنہ ۱۰۰۰ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے۔ اوّل اوّل شام اور ایشیائے کوچک کی حتی قوم (HITTITES) کو لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا اور وہ شدت کے ساتھ تحفۃً بھیجے اسے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ

کہ عام استعمال میں نہ آسکتا تھا۔ بعد میں فلستیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طالوت کی بادشاہی سے پہلے حتیوں اور فلستیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے تقریباً بے دخل کر دیا تھا، بائیبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے (یشوع باب ۱۷۔ آیت ۱۶۔ قضاۃ باب ۱۔ آیت ۱۹ باب ۴۔ آیت ۲ تا ۳)۔ ۱۰۲۰ ق م میں جب طالوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا بنا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا بڑا حصہ واپس لے لیا اور پھر حضرت داؤد (۱۰۰۴ تا ۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرق اُردن، بلکہ شام کے بھی بیشتر حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں آہن سازی کا وہ راز جو حتیوں اور فلستیوں کے قبضے میں تھا بے نقاب ہو گیا اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا، بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ فلسطین کے جنوب میں ادوم کا علاقہ خام لوہے (IRON ORE) کی دولت سے مالا مال ہے اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عقبہ اور ایلہ سے متصل حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی بندرگاہ عصیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معائنے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول استعمال کئے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (BLAST FURNACE) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حضرت داؤدؑ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہو گا، کیونکہ تھوڑی ہی مدت پہلے آس پاس کی دشمن قوموں نے اسی لوہے کے ہتھیاروں سے ان کی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ (۸۸)

حضرت سلیمانؑ کا دورِ نبوت و حکومت

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ (النمل۔ ۱۶)

ترجمہ:۔ اور داؤدؑ کا وارث سلیمانؑ ہوا اور اس نے کہا۔ لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں

۱؎ وراثت سے مراد مال و جائیداد کی وراثت نہیں، بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائیداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوتی بھی ہوتی تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو "سلیم" کا ہم معنی ہے۔ ۹۶۵ قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ ق م تک تقریباً ۴۰ سال فرمانروا رہے۔ ان کی حدود سلطنت کے متعلق ہمارے مفسرین نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے وہ انھیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمران بتاتے ہیں حالانکہ ان کی مملکت صرف فلسطین اور شرق اُردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ (۸۸)

ہوائی تسخیر اور بحری بیڑہ

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۔ (الانبیاء ۸۱)

ترجمہ:۔ "اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں۔"

اس کی تفصیل سورۂ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ "اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا شام کو۔"

پھر اس کی مزید تفصیل سورۂ ص میں یہ آئی ہے:۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ "پس ہم نے اس کیلئے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا۔" اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمانؑ کے لیے اس طرح تابع امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک مہینے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) داؤدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کہ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ "ہم انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے" (بخاری کتاب فرض الخمس) اور ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین "نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا، جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے" (مسند احمد مرویات ابوبکر صدیقؓ حدیث ۶۰، ۷۸) (۹)

کی مدت تک سے کے مقامات کا سفر بسہولت کیا جا سکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق باد موافق چلتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے دورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عصیون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحر احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے، اور دوسری طرف بحر روم کی بندرگاہوں سے ان کا بیڑا (جسے بائبل میں "ترسیسی بیڑہ" کہا گیا ہے) مغربی ممالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عصیون جابر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں ادوم کے علاقہ عربہ کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں پگھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق آئی ہے کہ وَاَسَلْنَا لَـهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ "اور ہم نے اس کے لیے پگھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا"۔ نیز اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک مہینے کی راہ تک ہوا کی رفتار کو "مسخر" کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار باد موافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمانؑ پر یہ کرم خاص تھا کہ وہ ہمیشہ ان کے دونوں بحری بیڑوں کو ان کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمانؑ کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ (وہ اس کے حکم سے چلتی تھی) کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، تو یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے۔ جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ (۹۱)

حضرت سلیمانؑ کے لیے تسخیر جنات

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (الانبیاء ۸۲)

ترجمہ: "اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔"

سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝

ترجمہ :۔ "اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے ۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا قصر، مجسمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے ـــ پھر جب ہم نے سلیمان کو وفات دے دی تو ان جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر واقعی غیب داں ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت مبتلا نہ رہتے" ۔

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جن تھے، اور جن بھی وہ جن جن کے بارے میں مشرکین عرب کا عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علم غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآن کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے تعصبات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن میں "شیطان" اور "جن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے، وہاں اس کی مراد کون سی مخلوق ہے اور قرآن کی رو سے وہ کون سے جن ہیں جن کو مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کا ایک مغالطہ

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ جن اور شیاطین جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور آس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے لیکن صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں ان کی اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ قرآن

میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں کا سیاق و سباق اور انداز بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انہی کی کون سی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اہرام مصری سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسان نے نہیں بنایا ہے اور کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کے لیے وہ جن اور شیاطین فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمانؑ کے لیے فراہم کرتے رہے ہیں (۹۲)

ملکہ سبا کا ایمان لانا

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ۔ (النمل آیت ۴۴)

ترجمہ:۔ "اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لیے، سلیمانؑ نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔"

یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمانؑ کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت تحفوں کو رد کرنا تھا جس سے ملکہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمانؑ کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوت حق کا علم ہوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ "ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے۔ اور مسلم ہو چکے تھے۔" چوتھی چیز ایک عظیم الشان تخت کا آناً فاناً مارب سے بیت المقدس پہنچ جانا تھا جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامان عیش و تنعم رکھتا ہے اور ایسے شاندار محل میں رہتا ہے وہ کس قدر غرور نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے۔ کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے اور اس کی زندگی فریفتگان حیات دنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اٹھنے پر مجبور کر دیا جو آگے اس کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔ (۹۳)

قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

(النمل۔ آیت ۴۴)

ترجمہ: اس پر وہ پکار اٹھی: اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔"

حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا یہ قصہ بائبل کے عہد عتیق و عہد جدید اور روایات یہود، سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔

عہدِ عتیق میں مذکورہ قصے کا خلاصہ

عہدِ عتیق میں اس قصے کا خلاصہ یہ ہے:

"اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمانؑ کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی ــــــ جب وہ سلیمانؑ کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی۔ سلیمانؑ نے ان سب کا جواب دیا ــــ اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ کی ساری حکمت اور اس کے محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس کی سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی، تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہ بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا ــــ اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے ــــ اور سلیمانؑ بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (۱ سلاطین ۱۰: ۱-۱۳) (یہی ملتا جلتا مضمون ۲ تواریخ ۹: ۱-۱۲ میں بھی ہے)۔

عہد جدید میں حضرت عیسیٰؑ کی تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکہ سبا کے متعلق منقول ہوا ہے۔

"دکھن کی ملکہ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھ کر ان کو مجرم ٹھہرائے گی کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمانؑ کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمانؑ سے بھی بڑا ہے۔"

(متی ۱۲: ۴۲، لوقا ۱۱: ۳۱)

قرآن اور عہد نامہ عتیق کے بیان میں مماثلت

یہودیوں کے ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن پاک سے ملتا جلتا ہے۔ ہُد ہُد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس کے ذریعے سے خط بھیجنا، ہُد ہُد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کر رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں لہٰذا اس میں اترنے کے لیے پائنچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے، مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگوانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ (۹۳)

فصل ۵

یہودی بابل کی اسیری کے زمانے میں

تعویذ گنڈوں کا دور دورہ

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرہ۔۱۰۲)

ترجمہ: "اور وہ لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین[1] تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔"

جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی، تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات و عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیطان نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انھوں نے سن کر دی۔ (۹۵)

قصہ ہاروت و ماروت

وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ

---

[1] شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں ہو سکتے ہیں۔ (مؤلف)

مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ۔ آیت ۱۰۲)

ترجمہ: "وہ سیکھنے لگے اس چیز کو جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت وماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ دو فرشتے جب کبھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہم ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔"

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو[1] انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا جس طرح قوم لوطؑ کے پاس فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انھوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی، اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹ پڑتے ہوں گے۔ (۹۶)

دوسروں کی بیویاں ہتھیانے کا فتنہ

اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے

لہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز کا سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش نہ رہنے دیں۔ (۹۷)

ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کرے۔ یہ اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ تھا جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔[1] (۹۸)

---

[1] ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں اس کو سناتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے "تو کام کر کے آیا ہے" اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انہیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔ (۹۹)

فصل ۹

بابل کی اسیری سے نجات کے بعد
حضرت عیسیٰؑ تک کا دور

یہود کو ایک اور مہلت اصلاح دی گئی

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ (بنی اسرائیل، آیت ۶)

ترجمہ :۔ "اور اس کے بعد ہم نے تمھیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔"

یہ اشارہ ہے اس مہلت کی طرف جو یہودیوں (یعنی اہل یہودیہ) کو بابل کی اسیری سے رہائی کے بعد عطا کی گئی۔ جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے، وہ تو اخلاقی و اعتقادی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اُٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے، اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیے گئے تھے۔

نقشۂ احوال پلٹ گیا

آخر کار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ثابت ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ ق م میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔

ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا گیا

سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی ـــــ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں، جو اس علاقے میں آباد ہو گئی تھیں مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر کار دارا یوس (دارا) اول نے ۵۲۲ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرُو بابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عزیرؑ[1] (عزرا) یہودیہ پہنچے اور شاہ ایران ارتخششتا (ارتا کسرسیز اردشیر) نے ایک فرمان کی رُو سے ان کو مجاز کیا کہ:

"تو اپنے خدا کی اس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کرتا کہ دریا پار کے سب لوگوں کا، جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں انصاف کریں اور تم اس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ، اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے، اس کو بلا توقف قانونی سزا دی جائے، خواہ موت ہو یا جلاوطنی، یا مال کی ضبطی یا قید (عزرا، باب ۷۔ آیت ۲۵-۲۶)

---

[1] وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ (التوبہ۔ آیت ۳۰)

ترجمہ:۔ "یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔"

عزیر سے مراد عزرا (EZRA) ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں ان کا زمانہ ۴۵۰ ق م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دور ابتلا بنی اسرائیل پر آیا اس میں نہ صرف یہ کہ تورات دنیا سے گم ہو گئی تھی، بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت، اپنی روایات اور اپنی قومی زبان، عبرانی تک سے ناآشنا کر دیا تھا۔ آخر کار انہی عزیر یا عزرا نے بائیبل کے پرانے عہد نامہ کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک کہہ دیا۔ قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق عزرا کو خدا کا بیٹا بنایا ہے، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی رونما ہوئی وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عزرا کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہو گئے۔ (۱۰۰)

حضرت عُزیرؑ کا کارنامہ تجدید و اصلاح

اس فرمان سے فائدہ اٹھا کر حضرت عُزیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انھوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتبِ خمسہ کو، جن میں تورات تھی، مرتب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے ان اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں، اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جنھیں یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے اور بنی اسرائیل سے از سرِ نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

۴۴۵ ق م میں نحمیاہ کے زیرِ قیادت ایک اور جلا وطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہِ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عُزیر کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بیت المقدس کے مقابلہ میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہ جرزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلۂ اہلِ کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہودیوں اور سامریوں کے درمیان بُعد اور زیادہ بڑھ گیا۔

یونانیوں کا فلسطین پر قبضہ

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مُدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اُس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی، ان میں سے شام کا علاقہ اس سلوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ یونانی فاتح جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔

یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کی مہم

۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا) تھا، جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل میں زبردستی بت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرائی۔ اس نے یہودیوں کو مشرکانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ان سب لوگوں کے لیے سزائے موت تجویز کی جو اپنے گھروں میں توراۃ کا نسخہ رکھیں، یا سَبت کے احکام پر عمل کریں یا اپنے بچوں کے ختنے کرائیں۔

مکابی تحریک اور اس کی کامیابی

مگر یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں اور انھوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے کے لیے انطاکیہ کے ظالموں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ لیکن عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی پھونکی ہوئی روح دین داری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخرکار انھوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی، جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اُس کے پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیر نگین تھے۔ بلکہ فلسطیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آگیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا (۱۰۱)

مکابی تحریک کا زوال اور رومی دورِ اقتدار

(اس دوسرے فساد اور اس کی سزا کا تاریخی پس منظر یہ ہے)

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی، اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخرکار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ اور انھوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی

بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فلسطین میں اپنے زیرِ سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی۔

یہ ریاست بالآخر ۴۰ قبل مسیح میں ایک ہوشیار یہودی، ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرق اردن پر ۴۰ سے ۴ قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ (۱۰۶)

باب ۶

حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا دور اور

یہود کا دوسرا فسادِ عظیم

فصل ا

یہودیوں کی اصلاح کے لیے حضرت یحییٰؑ کی مساعی

حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ۣاسْمُهٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝ (سورۃ مریم، آیت ۷)

ترجمہ:۔ "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔"

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوةً ؕ وَکَانَ تَقِیًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ۝ (سورۃ مریم، آیت ۱۲-۱۵)

ترجمہ:۔ "اے یحییٰ! کتابِ الٰہی کو مضبوط تھام لے۔" ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم" سے نوازا اور اپنی طرف سے اسے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے۔"

بیابان میں پکارنے والے کی آواز

حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں جمع کرکے ہم یہاں ان کی سیرت پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے سورۃ آل عمران اور اس سورۃ کے مختصر اشارات کی توضیح ہوگی۔ لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰ

کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے اور یوحنا کی روایت کے مطابق انھوں نے شرقِ اُردن کے علاقے میں دعوتِ الٰہی کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے۔

"میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو" (یوحنا ۱:۲۳)

یُوحنا بپتسمہ دینے والا

مرقس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے، اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے، تاکہ رُوح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیاہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے، اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے۔ (مرقس ۱: ۴۔ ۵)

اسی بنا پر ان کا نام "یُوحنا بپتسمہ دینے والا" (JOHN THE BAPTIST) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔ (متی ۲۱: ۲۶)

مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوئے، ان میں یُوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا" (متی ۱۱:۱۱)

وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے، اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متی ۳: ۴)

ان کی تعلیمات

اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آ گئی ہے"۔ (متی ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: ۴)

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی ۹: ۱۴)۔ لوقا ۵: ۳۳۔ لوقا ۱۱: ۱)، وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہوں، بانٹ دے۔ اور جس کے پاس کھانا ہو، وہ بھی ایسا ہی کرے"!

محصول لینے والوں نے پوچھا کہ "استاد ہم کیا کریں" تو انھوں نے فرمایا جو تمہارے لیے مقرر ہے اس

سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟" فرمایا "نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔" (لوقا ۳: ۱۰-۱۴) بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور صدوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا "اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟ ...... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے.... اب درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا، وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔" (متی ۳: ۷-۱۰)

یہودی فرمانروا کے ہاتھ حضرت یحییٰؑ کا قتل

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا، تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راست باز آدمی سمجھ کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا "مانگ کیا مانگتی ہے؟" بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہوا، مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رد کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰؑ کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (متی ۱۴: ۳-۱۲۔ مرقس ۶: ۱۷-۲۹۔ لوقا ۳: ۱۹-۲۰)

(جاری)

فصل ۲

حضرت عیسیٰؑ کی مساعیِ اصلاح اور یہود کا معاندانہ رویّہ

حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا۔ (آیت ۲۱)

ترجمہ: "فرشتے نے کہا، ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بڑا آسان ہے۔ ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔"

حضرت مریم کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اوپر انہی الفاظ میں حضرت زکریا کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیت ۲۸ - ۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ کَذٰلِکِ "ایسا ہی ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر کَذٰلِکِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جس طرح دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اسی صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے

کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔ (۱۰۴)

حضرت مریم کہیں دُور چلی جاتی ہیں

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ○ (مریم۔ آیت ۲۲)

ترجمہ:۔ "مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی"۔

دُور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف میں بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بے چاری اس شدید آزمائش میں ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں، تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سُسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر زچگی کے لیے تن تنہا ایک دُور دراز مقام پر چلی جاتیں۔ (۱۰۵)

حضرت مریم کی پریشانی

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ○ (مریم۔ آیت ۲۳)

ترجمہ:۔ "پھر زچگی کی تکلیف نے اسے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"۔

ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انہیں ڈالا ہے۔ اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔ (۱۰۶)

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد حضرت مریم کو ہدایت

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا (مریم: آیت ۲۶)

ترجمہ: "پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔"

مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی معترض ہو اس کا جواب ہمارے ذمے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)، یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریم کی اصل پریشانی کیا تھی، نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹھی کا بچہ اگر دُنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ (۱۰۷)

حضرت مریم اپنی قوم کے سامنے

يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (مریم: آیت ۲۸)

ترجمہ: "اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں ظاہری معنی میں لیا جائے کہ حضرت مریم کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں۔ کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مُضر (اے مضر کے بھائی) اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیل ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریم کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارون ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ اور انھوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے؟ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت کے منکر ہیں۔ وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریم کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور ان پر یہ طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟ (۱۰۸)

گہوارے میں حضرت عیسیٰؑ کا قوم کو جواب دینا

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ

صَبِیًّا (مریم۔ آیت ۲۹)

ترجمہ:۔ "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا۔ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟"

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے۔ کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی۔ اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے۔ وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آل عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰۔ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔ (۱۰۹)

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۔ (مریم۔ آیت ۳۲)

ترجمہ:۔ "اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ ان کو عیسیٰ ابن مریم کہا گیا ہے۔ (۱۱۰)

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (مریم۔ آیت ۳۳)

ترجمہ:۔ "سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا اور جب کہ میں مروں اور جب کہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ

بنی اسرائیل کی ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا۔ تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے۔ اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا۔ تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (١٤)

حضرت عیسیٰ یہودیوں کے لیے رسول اور نمونہ مقرر کیے گئے

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔

(آل عمران۔ آیت ٤٩)

ترجمہ:۔ "اور وہ رسول ہو گا بنی اسرائیل کی طرف (اور کہے گا کہ) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں"

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۔

(الزخرف۔ آیت ٥٩)

ترجمہ:۔ "ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا"

قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسیٰؑ کو بے باپ کے پیدا کرنا، پھر ان کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو نہ ان سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے، نہ ان کے بعد۔ وہ مٹی کا ایک پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے، وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے، حتیٰ کہ وہ مردے کو جلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہ منشا ہے کہ محض اس غیر معمولی پیدائش اور ان عظیم معجزات کی وجہ سے ان کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دینے کے

اس کی عبادت کرنا غلط ہے۔ اس کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ بنا دیا تھا۔ (۱۱۴)

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝

(آل عمران۔ آیت ۵۱)

ترجمہ: "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے۔

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلے میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون اور ضابطہ صرف اللہ کا ہو اور دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

تیسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں، اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی اور اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس یہ ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا

گیا جس طرح کہ اوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں اُن کے اندر ملتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسیح صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے، اُن کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

"تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" (متی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہل شہر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا "نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا" اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا "ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳:۳۳) آخری مرتبہ وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا "مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے" اس پر یہودی علماء ناراض ہوگئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا "اگر یہ چپ رہیں گے تو پتھر پکار اٹھیں گے" (لوقا ۱۹:۳۸-۴۰)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

"اے محنت اٹھانے والو! اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمھیں آرام دوں گا، میرا جُوا اپنے اوپر اٹھا لو...... میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا"

(متی ۱۱:۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کروانا چاہتے تھے، متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر مسیح نے فرمایا: "تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ یہ اُمت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دور ہیں۔ کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔ تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تو تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو بُرا کہے گا وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آ سکتی تھیں۔ انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متی ۱۵: ۱-۳۰ مرقس ۷: ۵-۱۳) (۱۱۳)

حضرت عیسیٰ دینِ موسیٰ کے مصدق تھے

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ (آل عمران آیت ۵۰)

ترجمہ: "اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔"

یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور سے تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ سے پہلے کے پیغمبر لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے مثلاً متی کی روایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں

بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔" (۵: ۱۷)

ایک یہودی عالم نے مسیح علیہ السلام سے پوچھا کہ احکام دین میں اوّلین حکم کون سا ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا:

"خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔"

(متی ۲۲: ۳۷: ۴۰)

پھر مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں:

"فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو مگر ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔" (متی ۲۳: ۲-۳) (۱۱۴)

علمائے یہود پر حضرت عیسیٰؑ کی تنقید

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر مترشح ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا: تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے، جو یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ "یہ اُمت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دُور ہیں کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں" تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو بلکہ اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو بُرا کہے وہ جان سے مارا جائے مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آ سکتی تھیں انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متی ۱۵: ۳-۹۔ مرقس ۷: ۵-۱۳) (تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۴۸)

شریعت سے یہودیوں کے انحراف کی ایک مثال

یہودی قانون میں زنا بزن غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

"اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو تو ان دونوں کو سزا ملے لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں۔ اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی۔" (احبار ۱۹ : ۲۰)

"جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور مار دیے جائیں۔" (احبار ۲۰ : ۱۰)

"اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔" (استثناء ۲۲ - ۲۲)

"اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو (یعنی اس کی منگنی ہو گئی ہو) اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پاکر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی۔ اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسائے کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پر اگر اس آدمی کو وہی لڑکی جس کی نسبت ہو چکی ہو کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے، تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مار ڈالا جائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔" (استثناء ۲۲: ۲۳ تا ۲۶)

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بہت پہلے یہودی علماء، فقہا، امراء اور عوام سب اس قانون کو منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ بائبل میں لکھا ہوا تھا اور خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتیٰ کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دعوتِ حق لے کر اٹھے اور علمائے یہود نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا کہ اس کا فیصلہ فرمایئے (یوحنا باب ۸ آیت ۱ - ۱۱) اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو کنوئیں یا کھائی دونوں میں سے کسی ایک میں کودنے پر مجبور کر دیں۔ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں، تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لیجیے یہ نرالے پیغمبر صاحب تشریف لائے ہیں، جنھوں نے دنیوی مصلحتوں کی خاطر خدائی قانون بدل ڈالا اور اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف رومی قانون سے آپ کو ٹکرا دیا جائے اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانو ان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا اب تورات کی پوری شریعت

تمہاری بیٹیوں اور جانوروں پر برسے گی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انہی پر الٹ دیا آپ نے فرمایا، تم میں سے جو خود پاک دامن ہے، وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ ایک ایک منہ چھپا کر چلتا ہو گیا۔ اور حاملانِ شرع متین کی اخلاقی حالت بالکل برہنہ ہو کر رہ گئی۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کے رخصت کر دیا، کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ آپ اس کے مقدمے کا فیصلہ کرتے، نہ اس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔ (۱۱۵)

یہودیوں نے دعوتِ عیسیٰؑ کو رد کر دیا

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ

(آل عمران آیت ۵۲)

ترجمہ: "جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو انھوں نے کہا کون اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔"

آلِ عمران میں یہی ارشاد ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (آلِ عمران آیت ۵۵)

ترجمہ: "(وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰ اب میں تجھے واپس لے لوں گا، اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے ان سے (یعنی ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے، اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔"

انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت

دی اور انھوں نے رد کر دیا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ (۱۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل اور سرداران قوم کا غصہ اس لیے بھڑکا تھا کہ وہ انھیں گناہوں اور ان ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان اور راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رُومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا، اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمھاری خاطر یسوع اور براباڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ براباکو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی باب ۲۷، آیت ۲۰ تا ۲۶) (۱۱۷)

یہودیوں کا زعم باطل کہ مسیح کو صلیب دی گئی

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النساء۔ ۱۵۷)

مترجمہ: اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے — حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا، نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا۔

یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سُولی پر چڑھائے جانے سے پہلے اٹھا لیے گئے تھے۔ اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیح نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے قرآن اور بائیبل کے بیانات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پیلاطس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھہرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذات مقدس نہ تھی، بلکہ کوئی اور شخص تھا، جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ ابن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا

ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے، اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس شبہے کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انہوں نے عیسیٰؑ ابن مریم کو سُولی دی ہے۔ درآنحالیکہ عیسیٰؑ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ (۱۱۸)

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور یہود کی گمراہی

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ (الزخرف) - آیت ۶۳ تا ۶۵)

ترجمہ: "اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔" مگر اس کی اس صاف تعلیم کے باوجود گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔"

اختلاف سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ نے ان کا انکار کیا تو مخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ان پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور ان کو اپنے نزدیک سُولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے ان کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غلو کر کے ان کو خدا بنا بیٹھا اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گتھی بنا جسے سلجھاتے سلجھاتے اس میں بے شمار فرقے بن گئے۔ (۱۱۹)

یہودی حضرت عیسیٰؑ کا انکار کیوں کرتے ہیں

دجّال، جس کے فتنۂ عظیم کا استیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا یہودیوں میں سے ہو گا، اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت

کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے در پے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ آخر کار بابل اور اسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تتر بتر کر دیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوش خبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک ایسے مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی ان توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اس مسیح موعود[1] (PROMISED MESSIAN) کے منتظر ہیں جن کے آنے کی خوش خبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ ان کا لٹریچر اس آنے والے دور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربیوں کے ادبیات میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ امید لیے بیٹھے ہیں کہ وہ مسیح موعود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انہیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس میں پھر سے جمع کر دے گا۔ (۱۲۰)

---

[1] خود "مسیح موعود" کی اصطلاح بھی ایک یہودی اصطلاح ہے نہ کہ اسلامی اصطلاح۔ (مؤلف)

فصل ۴

یہودیوں کا دوسرا فسادِ عظیم

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (بنی اسرائیل ایت ۷)

ترجمہ: "پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا، تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں۔ اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے۔ اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے، اُسے تباہ کر کے رکھ دیں۔"

فلسطینی ریاست کی تقسیم

ہیرودؔ[1] کے بعد اس کی ریاست تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

اس کا بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی اَدُومیہ کا فرمانروا ہوا، مگر ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی۔ اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اٹھے، اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر ان کی مخالفت کی اور رُومی گورنر پونتس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرود اینٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرقِ اُردن کا مالک ہُوا۔ اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہِ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہوا اور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رُومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمۂ خیر کے پنپنے کی اتنی گنجائش بھی نہ تھی، جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا جن پر ہیرود

[1] ہیرود کا تذکرہ اور متعلقہ تاریخی صورتِ واقعہ گزشتہ پچھلے باب کے آخر میں بیان کیا جا چکا ہے (مرتبین)

اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیحؑ کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی اور اپنا پورا زور خدا ترسی و اصلاحِ خلق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو حواریوں کی راہنمائی میں چل رہی تھی

اس دور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں ان پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیل اربعہ میں موجود ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کر دیا گیا مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیحؑ کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا مگر تھوڑے سے راستباز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اس بدبختی پر ماتم کرتا حد یہ ہے کہ جب پونتس پیلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ آج تمہاری عید کا دن ہے اور قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، بتاؤ مسیحؑ کو چھوڑوں یا برابا کو؟ تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر کی گئی۔

دوسرا فسادِ عظیم اور اس کی پاداش

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور [illegible] کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے آخرکار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتلِ عام میں ایک لاکھ تینتیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ اور یروشلم کا ہیکلِ مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اس کا نام ایلیا تھا۔ اور اس میں مدت ہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یہ تھی وہ سزا جو بنی اسرائیل کو دوسرے فسادِ عظیم کی پاداش میں ملی۔ (۱۳۱)

باب ۷

اپنے انبیاءؑ کے متعلق

یہود کی تہمتیں اور غلط بیانیاں

فصل

انبیاء پر یہودیوں کے لگائے ہوئے داغ اور قرآن

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انہوں نے داغدار کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار کیے جاتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغابازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی اور مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خاص تک، حتیٰ کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہا لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے اور اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ تمام جرائم، جو یہ خود کرتے تھے، انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی، غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی ایسی عظیم ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں؟ اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے مرتبے والوں کے لیے بھی شرمناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں؟ (۳۲)

یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انہوں نے خود اپنی قوم کے انبیاء پر ناپاک الزامات لگائے اور ان کی سیرتوں کو داغدار کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت

یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون (علیہم السلام) غرض کوئی بھی ان کی بدگوئیوں سے نہ بچ سکا لیکن سب سے زیادہ ظلم انہوں نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام پر کیا کہ ان کو انبیاء کی صف سے نکال کر معمولی بادشاہوں کی صف میں لا بٹھایا، اور ان کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ڈپلومیٹ ہیں، فاتح اور مدبر ہیں، جھوٹ، فریب، ظلم، اور ان تمام وسائل سے توسیع مملکت کرتے ہیں جن سے دنیا کے دوسرے فاتحوں اور جہانگیروں نے کام لیا ہے، اور اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو عام بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت داؤدؑ پر زنا اور حضرت سلیمانؑ پر شرک کا الزام لگانے میں بھی باک نہیں کیا۔[1] یہ اس قوم کا برتاؤ اپنے ان بزرگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اس کو ذلت کی خاک سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر پہنچایا۔ آج جن تاریخی مفاخر پر یہ قوم ناز کرتی ہے وہ سب انہی بزرگوں کی بدولت اسے نصیب ہوئے ہیں، اور انہی کی پاک سیرت پر اس نے سیاہی کے چھینٹے پھینکے ہیں۔[2]

دنیا میں صرف ایک قرآن ایسی کتاب ہے جس نے ان انبیاءؑ میں سے ایک ایک کی پوزیشن صاف کی، اور ان کے اصل مرتبہ و مقام سے دنیا کو روشناس کیا۔ اگر قرآن نہ آتا تو آج کوئی شخص ان بزرگوں کو نبی ماننا تو درکنار عزت سے ان کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتا۔ بنی اسرائیل چاہے اس احسان کو نہ مانیں، مگر احسان کا احسان ہونا اس کا محتاج نہیں کہ اس کا اعتراف بھی ہو۔

قرآن اور بائبل میں اتنا ہی فرق ہوجاتا ہے جتنا روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ قرآن بنی اسرائیل کے ایک ایک ہیرو کی زندگی کو روشن کرکے دکھاتا ہے اور اس کے دامن پر ایک معمولی لغزش کا داغ بھی دھوئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

---

[1] جو اصحاب اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ بائبل کے حسب ذیل مقامات نکال کر دیکھیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں، پیدائش باب ۹، آیت ۲۰۔ ۲۵ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق، کتاب پیدائش باب ۱۲۔ آیت ۱۰۔ ۲۰۔ باب ۲۰۔ آیت ۱۔۱۳ حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۱۹۔ آیت ۳۰۔ ۳۸۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۲۶۔ آیت ۶۔ ۱۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۲۷۔ آیت ۱۔ ۳۸۔ باب ۲۹۔ آیت ۱۶۔ ۲۹۔ باب ۳۲ مکمل۔ باب ۳۳۔ آیت ۲۲۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۳۷۔ آیت ۲۔۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق، گنتی باب ۳۱۔ آیت ۱۔ ۱۸۔ حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق، خروج باب ۳۲۔ آیت ۱۔ ۲۴۔

[2] صحیفہ سلاطین اول۔ باب ۱۱۔ آیت ۱۔ ۱۰۔ (از مؤلف)

مگر خود بنی اسرائیل جس کتاب کو کتاب مقدس کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ ان کے ہیروؤں کی وہ تصویر بھی پیش نہیں کرتی جو پاک طینت انسانوں کے ذہن میں آنی چاہیے، بلکہ ایسی تصویر پیش کرتی ہے جسے اس قوم کے نہایت بدطینت شُہدائے نے کھینچا تھا۔ یہودی اور عیسائی اس کتاب کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، حالانکہ اس میں ایک جگہ نہیں سینکڑوں مقامات پر ایسے بیانات اور ایسے خیالات ملتے ہیں جو خدا تو در کنار شریف انسانوں کے نفس کی بھی ترجمانی نہیں کرتے۔

اسرائیلی کیریکٹر کے کمالات یہیں ختم نہیں ہو جاتے۔ اس کی معراج آپ کو دیکھنی ہو تو یہ دیکھیے کہ جب قرآن نے اس قوم کے انبیاء کی صفائی پیش کی، اور اس کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں پر سے دھویا تو یہ خوش ہونے کے بجائے اُلٹے کبیدہ خاطر ہوئے، احسان مند ہونے کے بجائے مقابلے پر اُتر آئے، اور انہوں نے ان سب دامنوں کو جنہیں قرآن نے دھویا تھا، پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن جب نازل ہوا تو مدینہ میں یہودی موجود تھے، اور نزولِ قرآن کے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا۔ ان یہودیوں نے ہر نبی کے متعلق وہی [illegible] قصے جو ان کے ہاں مشہور تھے، مسلمانوں میں بھی پھیلا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی بہت سی تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھیں، ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ (۱۲۳)

فصل ۱۰

حضرت لوط علیہ السلام

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الاعراف۔ آیت ۸۰)

ترجمہ: "اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔"

یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرق اردن (FRANS JORDAN) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ تلمود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان بالکل ناپید ہو گیا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے، جسے آج کل بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہوگا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لوط علیہ السلام کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں[1] وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے

چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳ - آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (۱۲۲)

---

۱۲۲ اور لوط ضُغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیونکہ اُسے ضُغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اُس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اُسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اُس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ آؤ آج رات بھی اُس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اُس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اُس سے ہم آغوش ہوئی پر اُس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ سو لُوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اُس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اُس کا نام بن عمی رکھا۔ وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ (معاذ باللہ)

(پیدائش، باب ۱۹، ۳۰-۳۸)

فصل ۳

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

قرآن حضرت اسمٰعیل کو ذبیح قرار دیتا ہے

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ ....

.... وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ ۭ (الصّٰفّٰت۔ آیات ۱۰۰ تا ۱۱۳)

ترجمہ:۔ (ابراہیمؑ نے دعا کی) اے پروردگار مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے کہا، بیٹا میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا، ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں

سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی"

بائیبل کی تضاد بیانی

یہاں یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جس صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے تھے اور جنہوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے؟ سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائیبل کی طرف سے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ اے ابرہام...... تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا" (پیدائش ۲۲: ۱ تا ۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے، حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحٰقؑ اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسب ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی" (پیدائش ۱۶: ۱ تا ۴)

"خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا" (۱۶: ۱۱)

"جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا" (۱۶: ۱۶)

اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے...... اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا...... تو اس کا نام اضحاق رکھنا...... جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارہ سے پیدا ہوگا.....

تب ابرام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اور...... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے

مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۷: ۲۵-۲۶)

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرام سو برس کا تھا۔" (پیدائش ۲۱: ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ چودہ برس تک تنہا حضرت اسمٰعیل ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی تھی کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اسلامی روایات میں اختلافات کی حقیقت

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، قتادہؒ، عکرمہؒ، حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ، مسروقؒ، مکحولؒ، زہریؒ، عطاؒ، مقاتلؒ، سُدیؒ، کعب احبار، زیدؒ بن اسلم وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت معاویہؓ، عکرمہؒ، مجاہدؒ، یوسف بن مہرانؒ، حسن بصریؒ، محمد بن کعب القرظیؒ، شعبیؒ، سعیدؒ بن المسیب، ضحاکؒ، محمدؒ بن علی بن حسینؓ (محمد الباقر)، ربیع بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عکرمہؒ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے لیکن انہی سے عطاء بن ابی رباح یہ بات نقل کرتے ہیں زعمت الیھود انہ اسحٰق و کذبت الیھود "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاق تھے مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔" اسی طرح حضرت حسن بصریؒ سے ایک روایت ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے، مگر عمرو بن عُبید کہتے ہیں کہ

حسن بصریؒ کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔

حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کے واضح دلائل

لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر بے شک سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم بیٹے کی بشارت دی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلہ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے صاحبزادے اسماعیلؑ تھے نہ کہ اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ (ابراہیم۔ آیت ۳۹)

۲۔ قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے لیے غلام علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ فَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الذاریات۔ ۲۸) لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر۔ ۵۳) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کیلئے غلام حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلام علیم کے لیے نہیں بلکہ غلام حلیم کے لیے تھا۔

۳۔ قرآن مجید میں حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ حضرت سارہ کو یہ خوشخبری بھی دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (ہود) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا

رہا ہے۔ علامہ ابن جریرؒ اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت بودا سا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحب اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا، پھر جب حضرت ابراہیمؑ اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؑ نہ تھے بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریرؒ اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی، پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوش خبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ "ہم نے اس کو اسحاقؑ کی بشارت دی ایک نبی صالحین میں سے" بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

۵۔ معتبر روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانہ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا، اور خانہ کعبہ کو مسمار کر دیا، تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباسؓ اور عامر شعبیؒ دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خود خانہ کعبہ کے اندر یہ سینگ دیکھے ہیں۔ (ابن کثیر) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا ———————— اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

- یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا اور یہ صرف روایت ہی نہ تھی بلکہ اس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسک حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آرہا تھا کہ اسی مقام منیٰ میں جاکر لوگ اسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اسی طریقے کو جاری رکھا۔ حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاقؑ۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود امتِ مسلمہ میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کرکے اپنے دادا اسحاقؑ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کرلیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے وہ کہتے ہیں:

> "حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعب احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کے قدیم مندرجات ان کو سنایا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ ان کو سن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے، اور سب رطب و یابس جو بیان کرتے تھے انہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اس امت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کی ایک مجلسی بحث

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ۔ اس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان

ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا "امیر المومنین خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے۔ اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے۔" (ابن جریر) ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پراپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالہ سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کار فرما ہے۔ (۱۲۵)

فصل ۴

حضرت یعقوب علیہ السلام

وَجَآءُوٓ أَبَاهُمْ عِشَآءً يَبْكُونَ قَالُوا يَٰٓأَبَانَآ إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِندَ مَتَٰعِنَا فَأَكَلَهُ ٱلذِّئْبُ وَمَآ أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَٰدِقِينَ ۝ (یوسف۔ آیت ۱۶۔۱۷)

ترجمہ: "شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "اباجان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اُسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔"

وَجَآءُو عَلَىٰ قَمِيصِهِۦ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَٱللَّهُ ٱلْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (یوسف۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "اور وہ یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا، صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔"

بائبل اور تلمود یہاں حضرت یعقوبؑ کے تاثر کا نقشہ بھی کچھ ایسا کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ تب یعقوبؑ نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔" اور تلمود کا بیان ہے کہ "یعقوبؑ بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے کا قمیص ہے...... اور وہ سالہا سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا۔" اس نقشے میں حضرت یعقوبؑ وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی

انسان کی تصویر دکھاتی ہے جو کمال درجہ بردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے ٹھیک ٹھیک معاملہ کی نوعیت کو بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے اور پھر عالی ظرف انسان کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ (۱۴۶)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ٥ (یوسف ۹۴)

ترجمہ: "جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔"

ایک طرف قرآن حضرت یعقوبؑ کو اس پیغمبرانہ شان کے ساتھ پیش کر رہا ہے اور دوسری طرف بنی اسرائیل ان کو ایسے رنگ میں دکھاتے ہیں جیسا عرب کا ہر معمولی بدو ہو سکتا ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ جب بیٹوں نے آکر خبر دی کہ یوسفؑ اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملک مصر کا حاکم ہے تو یعقوبؑ کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اس نے ان کا یقین نہ کیا...... اور جب ان کے باپ یعقوبؑ نے وہ گاڑیاں دیکھ لیں جو یوسفؑ نے ان کو لانے کے لیے بھیجی تھیں تب اس کی جان میں جان آئی۔ (پیدائش، ۴۵: ۲۶-۲۷) (۱۴۷)

فصل ۵

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسفؑ کے خواب کا قصہ

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (یوسف ـ آیات ۵-۶)

ترجمہ: "جواب میں اس کے باپ (یعنی حضرت یعقوبؑ) نے کہا، بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپئے آزار ہو جائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوبؑ پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح وہ اس سے پہلے تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔"

بائیبل اور تلمود کا بیان قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔

لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے، نہ کہ بائیبل اور تلمود کا۔ حضرت یوسفؑ نے خواب بیان کیا تھا کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا

کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر بُرا ماننے اور خواب دیکھنے والے کو اُلٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے کے آئندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے اُلٹا جل بھن جائے؟ (۱۲۸)

بھائیوں کے خلاف چغلیاں کھانے کا الزام

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (یوسف - ۸)

ترجمہ:۔ "اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا: یہ یوسفؑ اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔"

حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمین تھے جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوبؑ ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ خاص طور پر حضرت یوسفؑ سے ان کی محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی ساری اولاد میں صرف وہی ایسے تھے جن کے بشرے سے ان کو آثارِ رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر انہوں نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے۔ پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے لیکن عجیب بات ہے کہ بائبل میں برادرانِ یوسفؑ کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے اُلٹا الزام حضرت یوسفؑ پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔ (۱۲۹)

کنوئیں میں ڈالے جانے پر حضرت یوسفؑ کی کیفیت

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (یوسف - ۱۵)

ترجمہ:۔ "اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے

کنویں میں چھوڑ دیں گے، تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔"

متن میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس کو وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں یہ چیز ان کو جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائیبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف کنوئیں میں ڈال دیے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔

قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو آگے چل کر تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے والا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنوئیں میں پھینک جاتے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا ایسے موقع پر کرے گا۔ (۱۴)

رہائی کے موقع کی غلط تصویر

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ (یوسف۔ آیت ۵۰)

ترجمہ: "بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔"

یہاں سے لے کر بادشاہ کی ملاقات تک جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے ـــ جو اس قصے کا بڑا ہی اہم مضمون ہے ـــ اس کا ذکر تلمود اور بائیبل میں نہیں ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر حضرت یوسف فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے، حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی گھٹیا صورت میں اس

واقعے کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ "بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسف کو میرے حضور پیش کرو اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسف کو قید خانے سے نکالا۔ حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہاں زر و جواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسف ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا اور جب ادنیٰ طبقے کا کوئی آدمی مخاطبے کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسف اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی۔" اس تصویر میں بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو جیسا کچھ پیش کیا ہے، اُسے نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن اُن کی قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان اور کس آن بان سے پیش کرتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر صاحبِ نظر کا کام ہے کہ ان دونوں تصویروں میں سے کونسی تصویر پیغمبری کے مرتبے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی عقلِ عام کو کھٹکتی ہے کہ اگر بادشاہ کی ملاقات کے وقت تک حضرت یوسف کی حیثیت اتنی ہی گری ہوئی تھی جتنی تلمود کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، تو خواب کی تعبیر سنتے ہی یکایک ان کو تمام سلطنت کا مختارِ کل کیسے بنا دیا گیا؟ ایک مہذب و متمدن ملک میں اتنا بڑا مرتبہ تو آدمی کو اُسی وقت ملا کرتا ہے جب کہ وہ اپنی اخلاقی اور ذہنی برتری کا سکہ لوگوں پر بٹھا چکا ہو۔ پس عقل کی رو سے بھی بائیبل اور تلمود کی بہ نسبت قرآن ہی کا بیان زیادہ مطابقِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ (۱۳۲)

فصل ۱۸

حضرت موسیٰ علیہ السلام

ان پر قتلِ عمد کا الزام

فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ ۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي ۔

(القصص، آیات ۱۵-۱۶)

ترجمہ: "موسیٰؑ نے اس کو گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰؑ نے کہا یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے۔ پھر وہ کہنے لگا میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھونسا کھاتے ہی مصری گرا ہوگا اور اس نے دم توڑ دیا ہوگا تو کیسی سخت ندامت اور گھبراہٹ کی حالت میں یہ الفاظ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ ان کا کوئی ارادہ قتل کا نہ تھا۔ نہ قتل کیلئے گھونسا مارا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ ایک گھونسا کھاتے ہی ایک بھلا چنگا آدمی پران چھوڑ دے گا۔ اس بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کوئی شریرانہ منصوبہ معلوم ہوتا ہے، اس نے ایک بڑا فساد کھڑا کرنے کے لیے مجھ سے یہ کام کرایا ہے تاکہ ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک قبطی کو مار ڈالنے کا الزام مجھ پر عائد ہو اور صرف میرے ہی خلاف نہیں، بلکہ تمام بنی اسرائیل کے خلاف مصر میں ایک طوفان عظیم اٹھ کھڑا ہو۔

اس معاملے میں بائبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کو قتلِ عمد کا مجرم ٹھہراتی ہے۔ اس کی روایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے اِدھر اُدھر نگاہ کی، اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔ (خروج ۲: ۱۲) یہی بات تلمود میں بھی بیان کی گئی ہے۔

اب یہ شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغ دار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی، جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا۔ اور جسے انسان کو عدل و انصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے اور جان بوجھ کر اسے قتل کر دے۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی کو مصری کے پنجے سے چھڑانے کے لیے اسے قتل کر دینا تو روا نہ ہو سکتا تھا۔ (۱۳۲)

مدین میں قید کا افسانہ اور بدکاری کا الزام

قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰٓأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ ۖ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ۝ قَالَ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ۔

(القصص۔ آیات ۲۶-۲۷)

ترجمہ: "ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان، اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا، میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں۔" ضروری نہیں ہے کہ بیٹی کی بات سنتے ہی باپ نے فوراً حضرت موسیٰ سے یہ بات کہہ دی ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے بیٹی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہو گی کہ آدمی شریف سہی مگر جوان بیٹیوں کے گھر میں ایک جوان تندرست و توانا آدمی کو یونہی ملازم رکھ چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ جب یہ شریف تعلیم یافتہ اور مہذب اور خاندانی آدمی ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰ کا قصہ سن کر انھیں معلوم ہو چکا ہو گا) تو کیوں نہ اسے داماد بنا کر ہی گھر میں رکھا جائے۔ اس رائے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے کسی مناسب وقت پر حضرت موسیٰ سے یہ بات کہی ہو گی۔

یہاں پھر بنی اسرائیل کی ایک کرم فرمائی ملاحظہ ہو جو انھوں نے اپنے جلیل القدر نبی، اپنے سب سے بڑے محسن اور قومی ہیرو پر کی ہے۔ تلمود میں کہا گیا ہے کہ "موسیٰ رعوئیل کے ہاں رہنے لگا اور وہ میزبان کی بیٹی صفورہ پر نظرِ عنایت رکھتا تھا، یہاں تک کہ آخرکار اس نے اس سے بیاہ کر لیا۔" ایک اور یہودی روایت جو جیوش انسائیکلوپیڈیا میں نقل کی گئی ہے یہ ہے کہ "حضرت موسیٰ نے جب یترو کو اپنا ماجرہ سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت تباہ ہونے کی پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے اس نے فوراً حضرت موسیٰ کو

قید کر لیا تاکہ انھیں فرعون کے حوالے کر کے انعام حاصل کرے۔ سات یا دس سال تک وہ اس کی قید میں رہے ایک تاریک تہہ خانہ تھا جس میں وہ بند تھے۔ مگر یتھرو کی بیٹی زفورا (یا صفورا) جس سے کنوئیں پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی چپکے چپکے ان سے قید خانے میں ملتی رہی اور انھیں کھانا پینا بھی پہنچاتی رہی۔ ان دونوں میں شادی کی خفیہ قرارداد ہو چکی تھی۔ سات یا دس سال بعد زفورا نے اپنے باپ سے کہا کہ اتنی مدت ہوئی آپ نے ایک شخص کو قید میں ڈال دیا تھا اور پھر اس کی خبر تک نہ لی۔ اب تک اسے مر جانا چاہیے تھا، لیکن اگر اب بھی وہ زندہ ہو تو ضرور کوئی خدا رسیدہ آدمی ہے۔ یتھرو اس کی یہ بات سن کر جب قید خانے میں گیا تو حضرت موسیٰ کو زندہ دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ وہ معجزے سے زندہ ہیں۔ تب اس نے زفورا سے ان کی شادی کر دی۔ (۱۴۳)

مفروضہ بیوی سے چالیس سال تک قطع تعلق کا الزام

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ (القصص۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: "مصر سے نکل کر جب موسیٰ نے مدین کا رُخ کیا تو اس نے کہا، امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔"

بائبل کا بیان اس معاملہ میں قرآن سے متفق ہے کہ حضرت موسیٰ نے مصر سے نکل کر مدین کا رُخ کیا تھا۔ مگر تلمود یہ بے سروپا قصہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے تھے، اور وہاں بادشاہ کے مقرب ہو گئے۔ پھر اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس کی بیوہ سے ان کی شادی کر دی۔ چالیس سال تک انھوں نے وہاں حکومت کی، مگر اس پوری مدت میں اپنی حبشی بیوی سے کبھی مقاربت نہ کی۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد اس عورت نے حبش کے باشندوں سے شکایت کی کہ اس شخص نے آج تک نہ تو مجھ سے زن و شو کا تعلق رکھا ہے اور نہ کبھی حبش کے دیوتاؤں کی پرستش کی ہے۔ اس پر امرائے سلطنت نے انھیں معزول کر کے اور بہت سا مال دے کر ملک سے باحترام رخصت کر دیا۔ تب وہ حبش سے مدین پہنچے۔ اُس وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

اس قصے کے بے سروپا ہونے کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اسی قصے میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس زمانے میں اسیریا (شمالی عراق) پر حبش کی حکومت تھی اور اسیریا والوں کی بغاوتیں کچلنے کے لیے حضرت موسیٰ نے بھی اور ان کے پیشرو بادشاہ نے بھی فوجی چڑھائیاں کی تھیں۔ اب جو شخص بھی تاریخ و جغرافیہ سے کوئی واقفیت رکھتا ہو وہ نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ اسیریا پر حبش کا تسلط اور حبشی فوج کا حملہ یا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مصر اور فلسطین و شام

پر اس کا قبضہ ہوتا یا پورا ملک عرب اُن کے زیر نگیں ہوتا یا پھر حبش کا بیڑا ایسا زبردست ہوتا کہ وہ بحر ہند اور خلیج فارس کو عبور کر کے عراق فتح کر لیتا۔ تاریخ اس ذکر سے خالی ہے کہ کبھی حبشیوں کو ان ممالک پر تسلط حاصل ہوا ہو، یا ان کی بحری طاقت اتنی زبردست رہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا علم خود اپنی تاریخ کے بارے میں کتنا ناقص ہے اور قرآن اُن کی غلطیوں کی تصحیح کر کے صحیح واقعات کیسی منقح صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن عیسائی اور یہودی مستشرقین کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی کہ قرآن نے یہ قصے بنی اسرائیل کی تاریخ سے نقل کیے ہیں۔ (۴۲)

پیغمبرانہ معجزات کے مقابلے میں جادوگروں کے ساحرانہ طلسمات

وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۖ وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الزخرف: آیت ۴۸)

ترجمہ: "ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی، اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا تاکہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔"

ان سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں بھی ہیں جنہیں لے کر حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے تھے یعنی عصا اور ید بیضاء، اور پھر وہ نشانیاں بھی جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعے سے ان کو دکھائیں، یعنی:

(۱) جادوگروں سے اللہ کے نبی کا برسرعام مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر ایمان لے آئے۔

(۲) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق مصر کی سرزمین میں شدید قحط برپا ہو گیا اور وہ ان کی دعا پر ہی دور ہوا۔

(۳) ان کے پیشگی اعلان کے بعد سارے ملک میں ہولناک بارشوں اور ژالہ باری اور گرج اور کڑک کے طوفان آئے جنہوں نے بستیوں اور کھیتوں کو تباہ کر ڈالا، اور یہ بلا بھی ان کی دعا سے ہی دفع ہوئی۔

(۴) پورے ملک پر ان کے اعلان کے مطابق ٹڈی دل کا خوفناک حملہ ہوا اور یہ آفت بھی اس وقت تک نہ ٹلی جب تک انہوں نے اسے ٹالنے کے لیے اللہ سے دعا نہ کی۔

(۵) ملک بھر میں ان کے اعلان کے مطابق جوئیں اور سُرسُریاں پھیل گئیں جن سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت مبتلائے عذاب ہوئے اور دوسری طرف غلوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ یہ عذاب بھی اسی وقت ٹلا جب حضرت موسیٰ سے درخواست کر کے دعا کرائی گئی۔

(۶) ٹھیک ان کے اعلان کے مطابق خون کا عذاب رونما ہوا جس سے تمام نہروں، کنوؤں، چشموں، تالابوں

اور حوضوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی کے ذخیروں میں عفونت پیدا ہو گئی اور پورے ایک ہفتہ تک مصر کے لوگ صاف پانی کو ترس گئے۔ یہ آفت بھی اُسی وقت ٹلی جب اس سے نجات پانے کے لیے حضرت موسیٰؑ سے دُعا کرائی گئی۔

بائیبل کی کتاب خروج باب ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ اور ۱۲ میں بھی ان عذابوں کی مفصل رُوداد درج ہے۔ مگر وہ گپ اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ویسا ہی لاکر دکھا دیا مگر جب جوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جوئیں پیدا نہ کر سکے اور انھوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا عذاب آیا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے۔ مگر اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰؑ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دُعا کر کے آپ عذاب کو دفع کرا دیجیے۔

سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر تھے تو فرعون نے ان ہی کے ذریعے سے عذاب دُور کیوں نہ کرایا؟ اور آخر یہ کیسے معلوم ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے ہیں اور جادوگروں کے مینڈک کون سے؟ اور یہی سوال خون کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے، تو جادوگروں نے کس پانی کو خون بنایا؟ اور کیسے پتہ چلا کہ فلاں جگہ کا پانی جادوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے؟ ایسی ہی باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بائیبل خالص کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کو جن لوگوں نے تصنیف کیا ہے انھوں نے اس کے اندر اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا دیا ہے اور غضب یہ ہے کہ یہ مصنفین کچھ تھے بھی واجبی سی عقل کے لوگ جنھیں بات گھڑنے کا سلیقہ بھی نہ تھا۔ (۳۵)

دوسروں کے زیورات ہتھیانے کے جرم کا الزام

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (طٰہٰ۔ آیت ۸۷)

ترجمہ:۔ "انھوں نے جواب دیا ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا"

پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا۔

یہ ان لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیئے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ ایسا تھا کہ

کچھ ایسا لطف دیکھا کہ ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے" اس کا یہ مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے، وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائیبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگے کے لیے تھے۔ اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات ہجرت کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا ہو، بلکہ یہ کار خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰ نے ان کو سکھایا تھا۔ اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی۔ بائیبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے۔

"خدا نے موسیٰ سے کہا...... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے۔

(باب ۳ آیت ۲۲-۱۴)۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا۔"

(باب ۱۱ آیت ۲-۳)

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا انہوں نے دے دیا سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔" (باب ۱۲ آیت ۳۵-۳۶)

افسوس کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اسی روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اسی لوٹ کا بوجھ تھا۔ (۱۳۶)

فصل

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت ہارونؑ پر بچھڑا بنانے اور اسے معبود بنانے کا الزام

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰہٰ ۔ آیت ۹۱)

ترجمہ: "مگر انھوں نے ہارونؑ سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے، جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آجائے۔"

بائیبل اس کے برعکس حضرت ہارونؑ پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا عظیم گناہ انہی سے سرزد ہوا تھا۔

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا جو ہمارے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰؑ کو، جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارونؑ نے ان سے کہا تمھاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارونؑ کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل، یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارونؑ نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہو گی۔" (خروج باب ۳۲۔ آیت ۱۔۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہو، بعد کے لوگوں نے اس ہارونؑ کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، بچھڑا خدا کے مقدس نبی نے ہی بنایا۔

تھا اور ان کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں، بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال، اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائیبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائیبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کے بعد بنی لاوی کو جمع کیا، اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے، انھیں قتل کیا جائے اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبانی تھے تو انھیں اس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے؟ کیا بنی لاوی یہ نہ کہتے کہ موسیٰؑ، ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہگار بھائیوں اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے، حالانکہ اصل گناہگار وہی تھا۔ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کا نام نہ مٹایا گیا، بلکہ اس کے برعکس ان کو اور اُن کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مقدِس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا (باب ۱۸، آیت ۱-۷)۔ کیا بائیبل کی یہ اندرونی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟ (۱۴۷)

قومی اتحاد کی خاطر شرک کو گوارا کرنے کا الزام

يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (طٰہٰ۔ آیت ۹۴)

ترجمہ: "ہارونؑ نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔"

حضرت ہارونؑ کے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قوم کا مجتمع رہنا اس کے ٹھیک راستے پر رہنے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور اتحاد چاہے وہ شرک پر ہی کیوں نہ ہو، افتراق سے بہتر ہے خواہ اس کی بنا حق اور باطل ہی کا اختلاف ہو۔ اس آیت کا یہ مطلب اگر کوئی شخص لے تو وہ قرآن سے ہدایت لینے کے بجائے گمراہی اخذ کرے گا۔ حضرت ہارونؑ کی پوری بات سمجھنے کے لیے اس آیت کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے جہاں وہ فرماتے ہیں۔

ہیں کہ "قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِیْ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ" "میری ماں کے بیٹے، ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ میں مجھے شمار نہ کر"۔ اب ان دونوں آیتوں کو جمع کر کے دیکھیے تو صورت واقعہ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس گمراہی سے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر انھوں نے آنجناب کے خلاف سخت فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تل گئے۔ مجبوراً آپ اس اندیشے سے خاموش ہو گئے کہ کہیں حضرت موسیٰؑ کے آنے سے پہلے یہاں خانہ جنگی برپا نہ ہو جائے، اور وہ بعد میں اگر شکایت کریں کہ تم اگر اس صورتحال سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے تو تم نے معاملات کو اس حد تک کیوں بگڑنے دیا؟ میرے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ سورۂ اعراف والی آیت کے آخری فقرے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم میں خود دونوں بھائیوں کے دشمنوں کی ایک تعداد موجود تھی۔ (۱۲۹)

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے دور میں سامری کے وجود کا انکار

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ (طٰہٰ: ۸۵)

ترجمہ: "اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا"

یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہر حال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السامری کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام ان اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی انتہا کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاذ اللہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولت اسرائیل کا دار السلطنت "سامریہ" اس واقعہ کے کئی صدی بعد ۹۲۵ء ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سن گن پائی ہوگی، اس لیے انھوں نے سے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے

عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بنائی ہیں جسے قرآن، فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اور عیسائی مبشری اور مستشرقین اسے اخسویرس (شاہ ایران) کے درباری امیر ہامان سے لے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدعیان علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبیلوں یا مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا حالانکہ سُمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں اس قوم کے یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولت اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص سمر نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا، اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا (سلاطین ۱۔ باب ۱۶۔ آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے سمر نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری، اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

فصل ۸

حضرت داؤد علیہ السلام

اوریاہ حتی کی بیوی کے متعلق گھناؤنا الزام

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (۲۶)

ترجمہ: "اے داؤدؑ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔"

یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی بھی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے یہ کہ اس سیاق و سباق میں اس کا ذکر کس مناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائیبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتاب مقدس) کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اوریاہ حتی (URIAH THE HITTITE) کی بیوی سے زنا کرنے اور پھر اوریاہ کو قصداً ہلاک کروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے اور یہ بھی لکھا گیا

کریبی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمانؑ کی ماں تھی۔ یہ پورا قصہ بائیبل کی کتاب سموئیل دوم۔ باب ۱۱۔ ۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائیبل میں درج ہو چکا تھا۔ دُنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں جو بھی اس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سنتا تھا، وہ اس قصے سے نہ صرف واقف تھا، بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا۔ انہی لوگوں کے ذریعہ سے یہ دُنیا میں مشہور ہوا اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤدؑ کے خلاف اس الزام کو دہرایا نہ جاتا ہو۔ اس مشہور قصے میں یہ بات بھی درج ہے کہ:

"خداوند نے ناتن کو داؤد کے پاس بھیجا۔ اس نے اس کے پاس جا کر اس سے کہا کسی شہر میں دو شخص تھے، ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلّے تھے۔ پر اس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا، جسے اس نے خرید کر پالا تھا اور وہ اس کے اور اس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی۔ وہ اسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالہ سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی۔ اور اس امیر آدمی کے ہاں کوئی مسافر آیا۔ سو اس نے اس مسافر کے لیے جو اس کے ہاں آیا تھا پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلّے میں سے کچھ نہ لیا، بلکہ اس غریب کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لیے جو اس کے ہاں آیا تھا، پکائی۔ تب داؤد کا غضب اس شخص پر بشدت بھڑکا اور اس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم، وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے۔ اس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا وہ شخص تُو ہی ہے .... تُو نے حتّی اُوریاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عمون کی تلوار سے قتل کروایا۔" (۲۔ سیموئیل باب ۱۲، فقرات ۱ تا ۹)

اس قصے اور اس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتاب پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔

قرآن کی بیان کردہ صحیح صورتِ واقعہ

اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں، بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتداءً تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے، چنانچہ انہوں نے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلہ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح ان کے اور اس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اس کا صدور خود ان سے اس شخص کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرما لیا۔

بائیبل میں اس کی وہ گھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو اس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعہ سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے ملک کی ملکہ ہونی چاہیے۔ اس خیال سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت انہوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ اگر ایک شخص کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی بُرا نہ مانتا تھا، بلکہ بسا اوقات ایک دوست دوسرے کے پاس خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تاکہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤدؑ کو اس امر کا احساس نہ ہوا کہ عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عنصر سے خالی ہو سکتا ہے مگر ایک فرمانروا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جائے، تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اس تمثیلی مقدمہ کے ذریعے سے ان کو توجہ دلائی گئی تو وہ بلا تامل اپنی خواہش سے دستبردار ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی خواہش اور کوشش کے بغیر اس خاتون کا شوہر کسی جنگ میں شہید ہو گیا اور

انھوں نے اُس سے نکاح کر لیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کر دی، اور یہ خبیث نفس اُس وقت اور زیادہ تیز رفتاری سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہو گیا۔ ان محرکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے معاذ اللہ، اُوریاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا جب کہ وہ برہنہ نہا رہی تھی، انھوں نے اس کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا اور جس سے وہ حاملہ ہو گئی، پھر انھوں نے اُوریاہ کو بنی عمون کے مقابلے پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر یوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کر دے جہاں وہ لازماً مارا جائے، اور جب وہ مارا گیا تو انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، اور اس عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی "کتابِ مقدس" میں ثبت کر دیے ہیں تاکہ نسلاً بعد نسل اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ (۱۴)

اس بیان کو سامنے رکھ کر جب ہم تورات کی روایت کو دیکھتے ہیں تو بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل واقعہ جب مشہور ہوا ہوگا تو اس پر حاشیے کس طرح چڑھ گئے ہوں گے۔

شریر النفس لوگوں کی حاشیہ آرائی

شریر النفس اور خبیث الطینت لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی آدمی، خصوصاً بڑے آدمی کے متعلق کچھ تھوڑی سی بات کی بھنک ان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو فوراً ان کی قوتِ تخیلہ اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور وہ محض اپنے ذہن سے بہت سی امکانی صورتیں فرض کر کے ان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ محقق واقعات ہیں۔ ہر انسان سے خواہ وہ کیسے ہی بڑے درجے کا آدمی ہو، کبھی نہ کبھی کوئی ایسا فعل ضرور ہو جاتا ہے جس کو آسانی کے ساتھ بُرے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ نے جو کچھ کیا تھا اگرچہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور[1] تھا اور اسی دستور سے متاثر ہو کر ان سے یہ لغزش سرزد ہو گئی تھی۔ مگر چونکہ ایک بڑے آدمی کا فعل تھا اس لیے فوراً شہرت پکڑ گیا، اور اس پر لوگوں

[1] اسرائیلیوں کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کر کے اس سے طلاق کی درخواست کرے۔ نہ درخواست کرنے والا اس میں تکلف کرتا تھا، اور نہ وہ شخص جس سے درخواست کی جاتی، اس پر بُرا مانتا تھا۔ اور یہ تو ایک عمدہ اخلاق کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص کسی دوست کو خوش کرنے یا اس کی تکلیف رفع کرنے کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کے نکاح میں دے دے۔ چنانچہ یہ یہودی اخلاق ہی کا اثر تھا کہ مدینہ میں بعض انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی خاطر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

نے حاشیے چڑھانے شروع کر دیے۔ اُوریاہ سے طلاق کا مطالبہ یہ گمان کرنے کے لیے کافی تھا کہ حضرت داؤدؑ اس کی بیوی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ جب لوگوں کے ذہن نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ میلان آخر ہوا کیونکر؟ کسی ذات شریف کو یہ بات سوچ بھی کرنا تھا کہ اپنے محل پر سے اس کو نہاتے دیکھ لیا ہوگا۔ مگر ان کی صداقت شعاری نے "ہوگا" کو محض "ہوگا" کی صورت میں بیان کرنا پسند نہ کیا، اس لیے انھوں نے "ہوگا" کو "ہے" میں تبدیل کر کے لوگوں سے بیان کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک واقعہ بن گیا۔ حالانکہ میلان ہونے کے بہت سے اسباب ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس خاتون کی قابلیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال سن کر اسے پسند کیا ہو، لیکن برے نفوس کی شرارت ہمیشہ ایسے واقعات میں برے امکانات ہی کی طرف مائل ہوتی ہے۔

پھر جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ حضرت داؤدؑ اس عورت کی طرف مائل ہیں، تو ان کی نالائق فطرت یہ بات ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئی کہ ایک بادشاہ کسی عورت کی طرف مائل ہو، اور وہ اسے حاصل نہ کرے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ بادشاہ نے اس عورت کو بلا لیا ہوگا۔ اور اس سے زنا کی ہوگی۔ یہ "ہوگا" بھی بہت جلدی "ہے" میں تبدیل ہو گیا اور اس پر عمل کا مزید حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

توضیح مزید

اسرائیلی قوم اس وقت تک ایک زندہ قوم تھی اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس کی غلطی پر ٹوکنے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ جب یہ قصہ مشہور ہوا تو اس قسم کے لوگوں میں سے دو آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے تمثیل کے پیرایہ میں ان کو متنبہ کیا۔ چنانچہ آنجناب فوراً اپنے فعل سے تائب ہو گئے۔ لیکن یا تو اس توبہ کا علم لوگوں کو نہیں ہوا، یا اگر ہوا بھی تو بدفطرت لوگوں کو اس کا یقین نہ آیا۔ بہرحال توبہ کے بعد حضرت داؤدؑ تو اپنی جگہ اُوریاہ کی بیوی کا خیال چھوڑ چکے تھے، مگر لوگوں نے اس کا خیال نہ چھوڑا۔ اُوریاہ ایک فوجی افسر تھا۔ اس کا کسی مہم پر جانا کوئی انوکھا فعل نہ تھا، اور جنگ میں اس کا مارا جانا بھی کوئی نرالی بات نہ تھی۔ مگر چونکہ لوگوں کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ تھا اور وہ ایک نبی کی بادشاہت اور ایک نفس پرست آدمی کی بادشاہت میں فرق کرنے سے اپنی طبیعت کی افتاد کی بنا پر عاجز تھے۔ اس لیے جب اُوریاہ جنگ میں گیا اور مارا گیا تو انھوں نے اس طرح قیاس قائم کیا کہ داؤدؑ اس کی بیوی پر مائل تھے اور وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اُوریاہ کا قصہ پاک کر کے اس کی بیوی کو حاصل کرنے کی پوری قدرت رکھتے تھے، اس لیے ضرور انھوں نے قصداً اُوریاہ کو جنگ پر بھیجا ہوگا۔ اور قصداً ایسی تدبیر کی ہوگی کہ مارا جائے۔ یہ "ہوگا" بھی بآسانی "ہے" میں تبدیل کر دیا گیا اور بڑھتے بڑھتے یہ آپ کو خط لکھنے کا قصہ تصنیف ہو گیا۔

کوئی شخص کسی عورت کو پسند کرتا ہو، اور وہ عورت بیوہ ہو جائے تو اس شخص کا اس عورت سے نکاح کر لینا کوئی نرالی یا معیوب بات نہیں ہے۔ مگر جب حضرت داؤدؑ نے بت سبع سے نکاح کیا (جیسا کہ بائیبل کا بیان ہے) تو اسرائیلی عوام نے سمجھا کہ یہ ان تمام افواہوں کی صداقت کا قطعی ثبوت ہے جو اس سلسلہ میں اُڑ رہی تھیں۔ یہاں پھر اسرائیلیوں نے اپنی اصلی طینت کا اظہار کیا۔ گو ایسے معاملات میں ہمیشہ دو متساوی القدر امکان ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص نے اپنی پسندیدہ عورت کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو، اور اس کے بیوہ ہو جانے کے بعد کوئی اخلاقی و قانونی مانع نہ پا کر اس سے نکاح کر لیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اسے حاصل کرنے کے لیے مجرمانہ تدبیریں کی ہوں۔ کسی ثبوت کی غیر موجودگی میں ایک امکان کو دوسرے امکان پر قطعی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ایسے مواقع پر انسان کی طینت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ نیک طینت آدمی کا میلان ہمیشہ اچھے امکان کی طرف ہوتا ہے، اور اگر کسی ایسے شخص سے ایسا واقعہ متعلق ہو جو صالح اور نیک چلن ہو تو نیک طینت یہی حکم لگائے گا کہ اس کا دامن پاک ہے۔ لیکن بدطینت آدمی ہمیشہ ہر طرف گندگی ہی گندگی ڈھونڈتا ہے۔ اس کی فطرت خود گندگی مانگتی ہے، اس لیے معاملات میں وہ ہمیشہ برے امکان ہی کو ترجیح دیتا ہے حتیٰ کہ اگر شہادت سے اس کی تردید ہو جائے تب بھی اندر سے اس کا دل نہیں مانتا۔

مدینہ کے یہودیوں نے اوریاہ کی بیوی کا قصہ اس کثرت سے مسلمانوں میں پھیلایا تھا کہ عام طور پر لوگ قرآن پاک کے اس رکوع کی تفسیر بائیبل اور اسرائیلی خرافات ہی کے رنگ میں کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ قرآن پاک کی معنوی تحریف کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان کرانے کی ضرورت پیش آئی کہ جو شخص اوریا و داؤدؑ کا قصہ بیان کرے گا اس کو ۱۶۰ کوڑے لگائے جائیں گے۔ ۸۰ کوڑے حد قذف کے اور مزید ۸۰ کوڑے ایک نبی کی توہین کے۔ (۱۴۱)

---

۱ اور نیک گمان کرنے کے لیے حضرت داؤدؑ کی پوری سیرت گواہ تھی۔ خود بائیبل ہی میں جہاں یہ قصہ بیان ہوا ہے اس سے پہلے اور اس کے بعد حضرت داؤدؑ کی پوری سوانح عمری درج ہے۔ ہر شخص اس کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ جو شخص ایسا عالی ظرف اور خدا ترس تھا اس سے وہ حرکات کیسے سرزد ہو سکتی تھیں جو اس بائیبل میں اس مردِ خدا کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔

۲ ملاحظہ ہو کشاف، تفسیر کبیر اور تفسیر بیضاوی۔

فصل ۱۳

حضرت سلیمان علیہ السلام

قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

(النمل۔ آیت ۴۴)

ترجمہ:۔ "اس پر وہ پکار اٹھی۔ اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العلمین کی اطاعت قبول کر لی۔"

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعہ خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا قیمتی ہدیہ سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں اور اس میں اترنے کے لیے پائینچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکۂ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا، اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۴۳)

اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور

شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱۱ ص ۴۳۹-۴۴۱) اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائبل انھیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکام الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا، اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا (۱۔سلاطین ۱۱: ۱-۱۱)

ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ (۱۴۲)

حضرت سلیمانؑ پر تصویر سازی کا الزام

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا (سورۃ سبا آیت ۱۳)

ترجمہ: "وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں، بڑے بڑے لگن جیسے لگن، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں ـــ اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر۔"

اصل میں لفظ تماثیل استعمال ہوا ہے جو تمثال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی گئی ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التمثال اسم للشیء المصنوع مشبها بخلق من خلق اللہ (لسان العرب) "تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔" التمثال کل ما صور علی صورة غيره من حيوان وغير حيوان (تفسیر کشاف) "تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔" اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے جو "تماثیل" بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ پھول، پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کر لیا ہو۔

غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کر لیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں

میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔ لیکن ان روایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس شریعت موسوی کے پیرو تھے۔ اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعت محمدیہ میں حرام ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انھوں نے آں جناب کو شرک و بت پرستی اور جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا ہے۔ اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کر کے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے وہ سب توراۃ کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراۃ کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب توراۃ کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔

"تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔" (خروج۔ باب ۲۰۔ آیت ۴)

"تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔" (احبار۔ باب ۲۶، آیت ۱)

"تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنا لو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین میں رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے ملتی ہو۔" (استثناء باب ۴۔ آیت ۱۶ تا ۱۸)

"لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خدا کے نزدیک مکروہ ہے، اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔" (استثناء باب ۲۷۔ آیت ۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جنوں سے لیا ہو گا؟ اور یہ بات آخر ان یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کر لی جائے جو حضرت سلیمانؑ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔ (۱۔ سلاطین۔ باب ۱۱) (۱۴۳)

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ (ص، آیات ۳۴-۳۵)

ترجمہ: "اور (دیکھو) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ اے میرے رب مجھے معاف کر دے اور مجھے بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جسد کا لاکر ڈالا جانا ان کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انھوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مختلف گروہوں نے مختلف مسلک اختیار کیے ہیں۔

انگوٹھی کا افسانہ

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں، مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی داد رسی نہ کی۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جن و انس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمانؑ کا سارا اقتدار چھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اور اس دوران میں وہ شیطان سلیمانؑ بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا۔ سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس زمانے میں شیطان سے حرم سلیمانی کی خواتین تک کی عصمت محفوظ نہ رہی۔ آخرکار سلطنت کے اعیان و اکابر اور علماء کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمانؑ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے سامنے توراۃ کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے گر گئی، یا خود اس نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کو مل گئی۔ اسے پکانے کے لیے انھوں نے اس کا پیٹ چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جن و انس سب سلام کرتے ہوئے سامنے حاضر ہو گئے۔

تلمودی روایات

یہ پُورا افسانہ سرتاپا خرافات پر مشتمل ہے جنھیں نو مسلم اہلِ کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کرکے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا، اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان میں نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ انگشتری سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیاء کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پُوری اُمت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔ آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمائش حضرت سلیمانؑ کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابعِ فرمان تھے۔ تعجب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں (۱۲۲)

فصل ۱۰

حضرت ایوب علیہ السلام

پیکر صبر کو پیکر اضطراب بنا دیا گیا

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء۔ آیات ۸۳، ۸۴)

ترجمہ: "اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا، اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔"

اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوب علیہ السلام کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سفر ایوب پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں: "نابود ہو وہ دن جس دن میں پیدا ہوا"۔ "میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا"۔ "میں نے پیٹ سے نکلتے ہی کیوں نہ جان دے دی"۔ اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ "قادر مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں۔" "اے بنی آدم کے ناظر، اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دور کر دیتا؟" "میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے ملزم نہ ٹھہرا۔"

مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مشورت کو روشن کرے"؟ اس کے تین دوست آ کر اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر و رضا کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکوکار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گنتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے؟ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اس کے دوست اس کی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہوتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوب کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ "اس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھہرایا"۔ اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں، اور پھر ان کے اور ایوب کے درمیان خوب دوبدو بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اس صبر مجسم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

سفر ایوب کے تین حصوں کا تضاد

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی تناسب نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ ایوب ایک انتہائی راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ "اہل مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا"۔ ایک روز خدا کے ہاں اس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر فخر کیا۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا، اچھا اس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی ذات کو کوئی

نقصان پہنچایا ہو۔ شیطان نے جا کر ایوبؑ کے تمام مال و دولت اور پورے خاندان کا صفایا کر دیا۔ اور ایوبؑ ہر چیز سے محروم ہو کر اکیلا رہ گیا۔ مگر ایوبؑ کی آنکھ پر بل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔" پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں بنگلے والے ہاں جمی، ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوبؑ کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب اس کے جسم پر ذرا مصیبت ڈال کر دیکھیے وہ آپ کے منہ پر آپ کی "تکفیر" کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا جا، اس کو تیرے اختیار میں دے دیا گیا۔ بس اس کی جان محفوظ رہے۔ اچھا تو شیطان واپس ہوا اور آکر اس نے "ایوبؑ کو تلوے سے چاند تک پھوڑوں سے دکھ دیا۔" اس کی بیوی نے اس سے کہا" کیا تو اب بھی راست بازی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا۔" اس نے جواب دیا" تو نادان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں؟"

یہ ہے صحیفۂ ایوب کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوبؑ کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات والزامات کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوبؑ کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب ردوبد بحث کر لینے کے بعد صبر و شکر اور توکل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر ایوبؑ ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں، اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا، اس سے دوچند اسے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ایوبؑ اور اللہ میاں دونوں ہی شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے تاکہ شیطان کے سامنے ان کی سبکی نہ ہو۔

سِفرِ ایوب محض شاعرانہ داستان طرازی ہے

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوبؑ کا، بلکہ حضرت ایوبؑ کے زمانے کا بھی نہیں ہے، اس کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصۂ ایوبؑ کو بنیاد بنا کر "یوسف زلیخا" کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوبؑ، الیفز تیمانی، سوخی بلدد، نعماتی ضوفر، براکیل بوزی کا بیٹا الیہو چند کیریکٹر ہیں

جن کی زبان سے نظامِ کائنات کے متعلق درحاصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زورِ بیان کی جس قدر چاہیے داد دے لیجیے۔ مگر کتبِ مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ ایوبؑ علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے، جتنا "یوسف زلیخا" کا تعلق سیرتِ یوسفیؑ سے ہے، بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہوگا جو اس کے زمانے میں مشہور رہی ہوں گی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہوگا۔ (۱۴۵)

باب ۸

ظہورِ اسلام اور یہودِ عرب

فصل ۱

عرب کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

اس موقع پر ضروری ہے کہ مدینہ طیبہ اور حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ اس کے بغیر آدمی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں جان سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار ان کے مختلف قبائل کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے۔

یہود عرب کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے اُن کے ماضی پر روشنی پڑ سکے۔ اور عرب کے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملت سے بچھڑ گئے تھے اور دنیا کے یہودی سرے سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثار قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں ان میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہود عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی روایات پر ہے جو اہل عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصہ یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

یہود عرب کا اپنے متعلق بیان

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالقہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمانِ نبی کی تعمیل کی، مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوب صورت جوان تھا، اسے انہوں

نے زندہ چھوڑ دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعتِ موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً یثرب آکر یہیں بس جانا پڑا۔ (کتاب الاغانی، ج ۱۹، صفحہ ۹۴)

اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ بارہ سو برس قبل مسیح سے یہاں آباد ہیں لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے گھڑا تھا کہ اہل عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی نسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ قبل مسیح میں ہوئی جب کہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتر بتر کر دیا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آکر وادی القریٰ، تیماء اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے۔ (فتوح البلدان، البلاذری) لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

اصل صورتِ واقعہ

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب سنہ ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا، اور پھر سنہ ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے بالکل نکال باہر کیا، اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انہوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سود خواری کے ذریعہ سے ان پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء، وادی القریٰ، فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آکر یثرب پر قابض ہوئے۔

یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں (Priests or Cohens) کے طبقہ میں سے تھے، انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آکر آباد ہوئے اُس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ ان کے تقریباً

تین صدی بعد مسیح یا ۴۵۰ء میں یمن کے اس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے قومِ سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوگئے۔ ان میں سے غسانی شام میں، لخمی حیرہ (عراق) میں، بنی خزاعہ جدہ و مکہ کے درمیان، اور اوس و خزرج یثرب میں جاکر آباد ہوگئے۔ یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اول اول اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی، اور یہ دونوں عرب قبیلے چاروناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں ان کو قوت لا یموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ آخرکار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لاکر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اوس و خزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہوگیا، یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جاکر بسنے پر مجبور ہوگئے، تیسرے قبیلے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بن تھی، اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلہ خزرج کی پناہ لینا پڑی اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر و بنی قریظہ نے قبیلہ اوس کی پناہ لی تاکہ اطرافِ یثرب میں امن کے ساتھ رہ سکیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے حجاز اور یثرب میں یہودیوں کی پوزیشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آغازِ ہجرت تک حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے

زبان، لباس، تہذیب، تمدن ہر لحاظ سے انہوں نے پوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کرلیا تھا، حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہوگئے تھے۔ ۱۲ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے ان میں سے بنی زعوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گنے چنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے اس کی زبان اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انہیں ممیز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوچکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے اور انہوں نے

خصوصیت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں نہ رہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ مگر اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو، یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہل عرب کو دین یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہل عرب کو وہ اُمّی کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان امیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال و طیب ہے۔ سرداران عرب کے ماسوا عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ انہیں دین یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایات عرب میں کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی، اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا جس کی وجہ سے عربوں پر ان کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

معاشی حالت

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی، کیونکہ وہ فلسطین اور شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے، اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے اور باہر کی دنیا میں ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلّے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ مرغبانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر ان ہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی ان کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ میخانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قینقاع زیادہ تر سنار، لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔

اس سارے تجارتی بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سُود خوری کا تھا جس کے جال میں انہوں نے گرد و پیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنھیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرح سود پر قرضے دیتے اور پھر سُود در سُود کا چکر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

ان کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انہیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں۔ کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے، وہ ان بڑی بڑی جائیدادوں اور باغات اور سرسبز زمینوں پر انھیں قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سود خواری سے پیدا کی ہیں۔ مزید برآں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے، تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر بارہا انھیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما بھی ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریق مخالف سے ہوتے تھے۔ یثرب میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اوس کے حلیف تھے اور بنی قینقاع خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہوئی تھی اس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ (۱۲۶)

فصل ۲

نزولِ قرآن کے وقت یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت

ایک سرسری جائزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد یہود[1] سے براہِ راست سابقہ پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے۔ اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا اور اصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ان کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے تورات میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود تورات کو انہوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معناً محفوظ تھا، اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح اُن میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء و مشائخ، ان کے سردارانِ قوم، اور ان کے عوام سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ دین کا سیدھا راستہ انہیں بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخوان گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام "مسلم" تک

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ نے ۱۲۷۲ ق م میں وفات پائی اور حضور ؐ سنہ ۶۱۰ء بعد مسیح میں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے۔ (مؤلف)

بھول چکے تھے محض یہودیت بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے نسلِ اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔[1]

نہ خدا پر ایمان نہ آخرت پر

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُونَ۔ (التوبۃ۔ آیت ۲۹)

ترجمہ:۔ "جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

اگرچہ اہلِ کتاب خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں لیکن فی الواقع وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ خدا پر ایمان رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی بس اس بات کو مان لے کہ خدا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خدا کو الٰہِ واحد اور ربِّ واحد تسلیم کرے اور اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے حقوق اور اس کے اختیارات میں نہ خود شریک بنے نہ کسی کو شریک ٹھہرائے۔ لیکن نصاریٰ اور یہود دونوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں تصریح بیان فرمایا گیا ہے۔ اس لیے ان کا خدا کو ماننا بے معنی ہے اور اسے ہرگز ایمان باللہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح آخرت کو ماننے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی یہ بات مان لے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ، اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکے گا۔ خدا کی عدالت میں بے لاگ انصاف ہوگا اور آدمی کے ایمان و عمل کے سوا کسی چیز کا لحاظ نہ کیا

---

[1] پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں۔ چنانچہ سورۂ البقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی اور مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کس چیز کی ہے۔ (از مؤلف) (۱۴۲)

جائے گا۔ اس عقیدے کے بغیر آخرت کو ماننا لاحاصل ہے لیکن یہود و نصاریٰ نے اسی پہلو سے اپنے عقیدے کو خراب کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کا ایمان بالآخرت بھی مسلّم نہیں ہے (۱۴۸)

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (التوبۃ۔ آیت ۳۲)

ترجمہ: "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

ان کا مذہبی تعصب

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (البقرہ۔ آیت ۸۹)

ترجمہ: "اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے ——— باوجودیکہ وہ خود اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اس نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیشگوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی وہ آئے اور کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہل مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثت محمدیؐ سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیہ کلام یہی تھا کہ "اچھا اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔" اہل مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں، مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

یہ بات کہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان گئے تھے کہ آپ وہی نبی ہیں جن کا وہ انتظار کر رہے تھے، اس کے متعدد ثبوت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُمّ المومنین حضرت صفیہؓ کی ہے جو خود ایک بہت بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا،

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔ (۱۴۹)

شرک سے لاپرواہی اور جزئیات کی ناپ تول

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ۔ (النساء۔ آیت ۴۸)

ترجمہ: "اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔"

جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت ارشاد ہوئی ہے اس میں زیرِ بحث اہلِ کتاب کا رویہ ہی ہے۔ وہ اگرچہ انبیاء اور کتبِ آسمانی کی پیروی کے مدعی تھے مگر شرک میں مبتلا تھے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا ہے تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ چھوٹے بڑے اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علماء یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقہاء نے

استنباط کر کے نکالے تھے مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔ (۱۵۰)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ (النساء۔ آیت ۵۱)

ترجمہ: "کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

جبت سے مراد ہیں اوہام و خرافات اور طاغوت سے مراد ہر معبود غیر اللہ ہے۔ علمائے یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک طرف تو وہ ان لغویات کو مانتے تھے اور دوسری طرف جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کو وہ مشرکین عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں۔ حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں اور دوسری طرف صریح بت پرستی ہے جس کی مذمت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔ (۱۵۱)

یہود کا خدائی قانون پر عمل پیرا ہونے سے اعراض

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (المائدہ۔ آیت ۴۳)

ترجمہ: "اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ مذہبی لوگ جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود

کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے بہ شدت ان کو انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے۔ دراصل ان کا ایمان ان کے اپنے نفس اور خواہشات پر ہے۔ جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لئے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔ (۱۵۲)

فصل ۳

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود کے مخالفانہ ہتھکنڈے

مسلمانوں کے خلاف مشرک قبائل سے ساز باز

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

(البقرہ۔ آیت ۷۶)

ترجمہ: "محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں بیوقوف ہو گئے ہو، ان لوگوں کو وہ باتیں بتلاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انھیں حجت میں پیش کریں؟"

وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیشگوئیاں اس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے انھیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو ورنہ یہ تمہارے رب کے سامنے ان کو تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ دنیا میں اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔ (۱۵۳)

ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے ان معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگ بدر کے موقع پر ان اہل کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔

بدر کے بعد یہودی کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلا دلا کر بدلہ لینے پر اکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہل مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کی ہمسائیگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے ان کا پاس و لحاظ بھی انہوں نے اٹھا دیا۔ آخر کار جب ان کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حد برداشت سے گزر گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قینقاع پر جو ان یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور انہیں اطراف مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتش عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے مدینہ کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ اس زمانے میں بالعموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شبخون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابہ کرامؓ گھبرا کر آپ کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ (۱۵۴)

مذہبی اثر کا معاندانہ استعمال

جو نو مسلم ہجرت سے کچھ پہلے یا اس کے بعد قریب کے زمانے ہی میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کے کانوں میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب انہوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں سے سنی تھیں، اور یہ بھی انہوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہل مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سن کر آپ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق در جوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتب آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمت ایمان میسر آئی ہے وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پرجوش نو مسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار کی صورت میں دیتے تو منافقین اور مخالفین اسلام اس سے یہ استدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ

اہل کتاب جسے کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ (۱۵۵)

تلبیس حق اور کتمان حق

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ: آیات ۴۱، ۴۲)

ترجمہ: "اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی لہذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو، اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔"

تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اس کے احکام اور ایمان کی ہدایت کو رد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہر حال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے کیونکہ حق یقیناً ایک گراں تر چیز ہے۔ (۱۵۶)

اہل عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے، اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا زیادہ چرچا تھا اور انفرادی طور پر ان میں ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے۔ رات دن ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہل کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے

ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ مگر وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف، اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔

ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے قرآن میں فرمایا گیا کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو۔ اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکا نہ دو۔ (۱۵)

ذو معنین الفاظ کا شر پسندانہ استعمال

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(البقرہ۔ آیت ۱۰۴)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو، رَاعِنَا نہ کہا کرو، بلکہ اُنظُرنَا کہو اور توجہ سے بات سنو، یہ کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

یہودی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے، ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔

قرآن میں ایسی کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے یہ ایک ذومعنی لفظ تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھہریے ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ایک ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "سُن، تو بہرا ہو جائے" اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحب رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمہاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لپکا دے کر رَاعِينَا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے اُنظُرْنَا کہا کرو یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے یا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ توجہ سے بات سنو یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں مگر تمہیں غور سے نبی کی باتیں سننی چاہئیں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ (۱۵۸)

وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ۔ (النساء۔ آیت ۴۶)

ترجمہ: "اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے وہ اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا

یعنی جب انھیں خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں سَمِعْنَا (ہم نے سن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں عَصَيْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا) یا أَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفظ اس انداز سے زبان کو لپکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔

یعنی دورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں اِسْمَعْ (سنیے) اور پھر ساتھ ہی غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذو معنی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ محترم ہیں آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جا سکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں کوئی بات سنائی جائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے کہ تم بہرے ہو جاؤ۔ (۱۵۹)

صبح اسلام لاؤ شام کو کفر کرو

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ
وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (آلِ عمران۔ آیت ۷۲)

ترجمہ: "اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کردو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔"

یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بد دل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے وہ علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں، پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ کہتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے۔ (۶۰)

مسلمانوں سے منافقانہ رویہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا
عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ
أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ
وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ ۚ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا
آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن
تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ
شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ (آلِ عمران۔ آیت ۱۱۸ تا ۱۲۰)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایت دے دی ہے، اگر تم عقل رکھتے

ہوا تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے ،تم اُن سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے۔ مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ـ ان سے کہہ دو اپنے غصہ میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے۔ تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔

مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس و خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ مگر یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت ہو گئی تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انہوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کر دیں اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ (۱۶۱)

شبہات پھیلانے کی کوشش

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا (البقرہ۔ آیت ۱۰۶)

ترجمہ: ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔

یہودی مسلمانوں کے دلوں میں جو شبہات ڈالنے کی کوشش کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ

اس میں دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمہارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اس تعلیم کے ایک حصّے کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں۔ یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔ (۱۶۲)

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (البقرہ۔ آیت ۱۰۶ : میں تبیان)

فصل ہم

ایک مقدمۂ زنا میں یہود کا اپنے مذہب سے انحراف

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (المائدہ آیات ۴۲-۴۳)

ترجمہ: یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں، لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے —— اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔

یہاں خاص طور پر ان کے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھوٹی شہادتیں لے کر اور جھوٹی رودادیں سن کر ان لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی، یا جن کے ساتھ ان کے ناجائز مفاد وابستہ تھے۔

یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی، اور ان کے مقدمات کے فیصلے انہی کے قوانین کے مطابق ان کے علماء کرتے

تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لانے کے لیے وہ ازروئے قانون مجبور نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرانا نہیں چاہتے تھے ان کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر آجاتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہودیوں کا خفیہ مشورہ

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے اس کی سزا رجم تھی یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے۔ (استثناء۔ باب ۲۲۔ آیت ۲۳۔۲۴) لیکن یہودی اس سزا کو نافذ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے، اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔

یہودیوں کا پول کھل گیا

اس پر آپ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی سزا کیا ہے؟ انھوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کرکے گدھے پر سوار کرنا۔ آپ نے ان کے علماء کو قسم دے کر ان سے پوچھا کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا لیکن ان میں سے ایک شخص ابن صوریا جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا خاموش رہا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طور پر تمہیں شریعت عطا کی، کیا واقعی تورات میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انہیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کرکے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

یہود کی نمائشی مذہبیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ "مذہبی لوگ" جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علمِ کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو وہ خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ وہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے۔ دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے۔ جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس لیے جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔ (۱۶۳)

فصل ۵

نامعقول اعتراضات اور بے تکے مطالبات

یہود کو اسلامی اصلاحات سخت ناگوار تھیں

منافقین اور قدامت پسند جہلا اور نواحی مدینہ کے یہودیوں کو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمدن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ۔ بیوہ عورت کا سسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لئے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ متبنّٰی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے متبنّٰی کی بیوہ اور مطلقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رسوم کے پرستار چیخ اٹھتے تھے۔ قرآن کے احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے رہتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے آج جو نئے احکام یہاں آئے ہیں ان کی رو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اس وقت احکام الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات

دوسری طرف یہودی تھے جنہوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انہوں نے شریعت میں بڑھالی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اوہام تھے

جن کو انھوں نے قوانینِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سن کر بیتاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہا کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اوہام و خرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا، نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھتے، بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی۔[۱] (۲۶۴)

کعبہ کو قبلہ بنانے پر ان کا اعتراض

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔ (آل عمران۔ آیۃ ۹۶)

ترجمہ: "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسان کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔"

یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا۔ حالانکہ پچھلے انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا تھا۔[۲] لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مصر رہے۔ لہٰذا پھر اس کا جواب دیا گیا۔ بیت المقدس کے متعلق خود بائیبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ

---

[۱] یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورہ بقرہ آیت ۲۲۲ میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے، باقی تمام تعلقات عورت کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔ (۲۶۵)

[۲] ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۴۔ تشریح کے لیے دیکھیں تفہیم القرآن، البقرہ، حاشیہ ۱۴۸ (از مؤلف)

حضرت موسیٰؑ جنکے ساٹھ سے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا (۱۔ سلاطین، باب ۶ - آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانہ میں وہ قبلۂ اہل توحید قرار دیا گیا۔ (کتاب مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰)۔ برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبہ کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ (۱۹۶)

رسول اللہ کی بشریت پر اعتراض

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي (الانعام - آیت ۹۱)

ترجمہ: ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا اس کو کس نے نازل کیا تھا؟

سلسلۂ بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے اس لیے قدرتی طور پر کفار قریش اور دوسرے مشرکین عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ تم بھی اہل کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔

اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو جسے مخالفین اسلام نے حجت بنا رکھا تھا نقل کر کے اس کا یہ جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے تو موسیٰؑ پر کتاب کس نے نازل کی تھی؟

حلّت و حرمت کے متعلق فقہی اعتراض

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِھٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۔ (آل عمران - آیت ۹۳)

ترجمہ: کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے

لہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ

خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔"

قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علماء یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ اساسی دین جن امور پر ہے ان میں انبیاء سابقین کی تعلیمات پر اور نبی عربی کی تعلیم میں یک سر مو فرق نہ تھا) تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانے سے حرام چلی آ رہی ہیں۔

اسرائیل سے مراد اگر بنی اسرائیل لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نزول تورات سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے رکھی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بناء پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انھیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی موخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعد والی آیت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حرمت کا جو حکم بائیبل میں لکھا ہے وہ اصل تورات کا حکم نہیں ہے بلکہ یہودی علماء نے اسے بعد میں داخل کتاب کر دیا ہے۔ (۱۹۸)

حضرت زینبؓ کے نکاح پر مفسدانہ پروپیگنڈہ۔

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ

سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچی باتوں کو رد کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی مسلّم صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو رد کرنے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے تھے کہ حضورؐ کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گزرتے تھے (مولف)

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علم حق اور ہدایت نامہ زندگی نازل نہیں کیا ہے وہ یا تو بشر پر نزول وحی کو ناممکن سمجھتا ہے، اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے، یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرف کے اختیارات تو دے دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ اسے دنیا میں اندھا دھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔ (۱۹۹)

لیتے ہیں، اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انھیں گرا رہی ہیں تو انھیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دُور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر خوب گندگی اچھالیں تاکہ دنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کا رُخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر رذیلانہ حملوں اور داخلی فتنہ انگیزیوں کی طرف پھیر دیا اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے اس لیے بالارادہ یا بلا ارادہ طریق کار یہ قرار پایا کہ مدینہ کے منافقین اندر سے فتنے اٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔"

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذیقعدہ ۵ھ میں ہوا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے متبنیّت کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے متبنّٰی (زید بن حارثہؓ) کی مطلقہ بیوی (زینب بنت جحشؓ) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینہ کے منافقین پروپیگنڈا کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پردازیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے عجیب عجیب قصے گھڑ گھڑ کر پھیلا دیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دستبردار ہو گیا اور پھر کس طرح انھوں نے اپنی بہو سے بیاہ کر لیا ...... حالانکہ حضرت زینبؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحب زادی تھیں، بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضورؐ کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، ان کو ایک روز اتفاقاً دیکھ لینے اور معاذاللہ ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعہ سے ایک ہی سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو مجبور کر کے حضرت زیدؓ سے ان کی شادی کی تھی۔ (۴۷۹)

اللہ کا مذاق اڑانے کی جسارت

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ

(آل عمران: ۱۸۱)

ترجمہ: "اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔"

یہ یہودیوں کا قول تھا۔ قرآن مجید میں جب یہ آیت آئی کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

(کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے) تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہنا شروع کیا کہ جی ہاں اللہ میاں مفلس ہو گئے ہیں، اب وہ بندوں سے قرض مانگ رہے ہیں (۱۷۰)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ؕ (المائدہ۔ آیت ۶۴)

ترجمہ:۔ "یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے، پس یہود یکے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے، چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلت اور نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گذشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی جس کے واپس آنے کا کوئی امکان ان کو نظر نہ آتا تھا اس لیے بالعموم قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہتے تھے کہ معاذ اللہ خدا بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کیلیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا کچھ نہیں رہا۔ (۱۷۱)

جبریلؑ سے عداوت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ۔ آیت ۹۷)

ترجمہ:۔ "ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔"

یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ پر ایمان لانے والوں ہی کو برا نہ کہتے تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریل کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہمارا دشمن ہے وہ رحمت کا نہیں بلکہ عذاب کا فرشتہ ہے۔ اس بنا پر فرمایا گیا کہ تمہاری گالیاں جبریلؑ پر نہیں بلکہ خداوند بزرگ کی ذات پر پڑتی ہیں۔ (۱۷۲)

لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار کر دکھایئے

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء، آیت ۱۵۳)

ترجمہ:۔ "یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ

تو اس سے بڑھ کر مطالبہ یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں، اس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو۔"

مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ (۱۴۳)

سوختنی قربانی کا مطالبہ

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (آل عمران۔ آیت ۱۸۳)

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھائے۔ ان سے کہو تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی کی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی (قضاۃ ۶: ۲۰-۲۱، ۱۳: ۱۹-۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائبل میں آتا ہے کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آکر اسے کھا لیتی تھی (اخبار ۹: ۲۴-۲ تواریخ ۔ ۷: ۱-۳) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی ضروری علامت ہے یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ آئے۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاسؑ (ایلیاہ تشبی)

کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔ جس کی قربانی غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلق کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاسؑ کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے قتل کے درپے ہوا، اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی (۱۔ سلاطین۔ باب ۱۸، ۱۹) اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ حق کے دشمنو! تم کس منہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا انھی کے قتل سے تم کب باز رہے۔ (۱۷۴)

معاہدۂ مدینہ اور یہود کی خلاف ورزیاں

جب مدینے میں اسلام پہنچا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی تو آپ نے اس ریاست کو قائم کرتے ہی جو اولین کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی، اور دوسرا یہ تھا کہ اس مسلم معاشرے میں اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ سب متحدہ دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کے چند اہم فقرے یہ ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں کن امور کی پابندی قبول کی تھی:

ان على اليهود نفقتهم وعلى المسلمين نفقتهم، وان بينهم النصر على من حارب اهل هذه الصحيفة، وان بينهم النصح والنصيحة والبر دون الاثم، وانه لم يأثم امرؤ بحليفه، وان النصر للمظلوم، وان اليهود ينفقون مع المؤمنين ما داموا محاربين، وان يثرب حرام جوفها لاهل هذه الصحيفة ...... وانه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده فان مرده الى الله عز وجل والى محمد رسول الله ..... وانه لا تجار قريش ولا من نصرها، وان بينهم النصر على من دهم يثرب ..... على كل اناس حصتهم من جانبهم الذي قبلهم (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۷ تا ۱۵۰)

ترجمہ: "یہ کہ یہودی اپنا خرچ اٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ، اور یہ کہ معاہدے کے شرکا حملہ

اور تیسرے کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوں گے۔ اور یہ کہ وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کے درمیان نیکی و حق رسانی کا تعلق ہوگا نہ کہ گناہ اور زیادتی کا۔ اور یہ کہ کوئی اپنے حلیف کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا اور یہ کہ مظلوم کی حمایت کی جائے گی، اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کے مصارف اٹھائیں گے۔ اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکا پر یثرب میں کسی نوعیت کا فتنہ و فساد کرنا حرام ہے، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء کے درمیان اگر کوئی ایسا قضیہ یا اختلاف رونما ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق محمد رسول اللہ کریں گے .... اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی، اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکاء معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے ..... ہر فریق اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔"

یہ ایک قطعی اور واضح معاہدہ تھا جس کی شرائط یہودیوں نے خود قبول کی تھیں لیکن بہت جلدی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش کا اظہار شروع کر دیا اور ان کا عناد روز بروز سخت سے سخت ہوتا چلا گیا۔

یہود کی عہد شکنی کے تین وجوہ

اس کے بڑے بڑے وجوہ تین تھے:

ایک یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک رئیس قوم دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے ساتھ بس ایک سیاسی معاہدہ کر کے رہ جائے اور صرف اپنے گروہ کے دنیوی مفادات سے سروکار رکھے مگر انھوں نے دیکھا کہ آپ اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں (جس میں خود ان کے اپنے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل تھا) اور معصیت چھوڑ کر ان احکام الٰہی کی اطاعت اختیار کرنے اور ان اخلاقی حدود کی پابندی کرنے کی طرف بلا رہے ہیں جن کی طرف خود ان کے انبیاء بھی دنیا کو بلاتے رہے ہیں۔ یہ چیز ان کو سخت ناگوار تھی۔ ان کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ عالمگیر اصولی تحریک اگر چل پڑی تو اس کا سیلاب ان کی جامد مذہبیت اور ان کی نسلی قومیت کو بہا لے جائے گا۔

دوسری یہ کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر، اور یہ دیکھ کر کہ گرد و پیش کے عرب قبائل

ہیں سے کھچی چلو گی اسلام کی اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں وہ سب مدینے کی اس اسلامی برادری میں شامل ہو کر ایک قوت بنتے جا رہے ہیں۔ انھیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ صدیوں سے اپنی سلامتی اور اپنے مفادات کی ترقی کے لیے انھوں نے عرب قبائل میں پھوٹ ڈالنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ اب اس نئے نظام میں نہ چل سکے گی بلکہ اب ان کو عربوں کی ایک متحدہ طاقت سے سابقہ پیش آئے گا جس کے آگے ان کی چالیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

تیسرے یہ کہ معاشرے اور تمدن کی جو اصلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے اس میں کاروبار اور لین دین کے تمام ناجائز طریقوں کا سدِ باب شامل تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سُود کو بھی آپ ناپاک کمائی اور حرام خوری قرار دے رہے تھے جس سے انھیں خطرہ تھا کہ اگر عرب پر آپ کی فرمانروائی قائم ہو گئی تو آپ اسے قانوناً ممنوع کر دیں گے اس میں ان کو اپنی موت نظر آتی تھی۔

ان وجوہ سے انھوں نے حضورؐ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنا لیا اور آپ کو زک دینے کے لیے کوئی چال، کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تامل نہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک و شبہات اور وسوسے ڈالتے تھے تاکہ وہ اس دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کر کے مرتد ہو جاتے تھے تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جا سکیں۔ فتنے برپا کرنے کے لیے منافقین سے ساز باز کرتے تھے۔ ہر اس شخص اور گروہ اور قبیلے سے رابطہ پیدا کرتے تھے جو اسلام کا دشمن ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور ان کو آپس میں لڑا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ اوس اور خزرج کے لوگ خاص طور پر ان کے ہدف تھے جن سے ان کے مدت ہائے دراز سے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ جنگ بُعاث کے تذکرے چھیڑ چھیڑ کر وہ ان کو پرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اُخوت کا وہ رشتہ تار تار ہو جائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا۔ مسلمانوں کو مالی حیثیت سے بھی تنگ کرنے کے لیے وہ ہر قسم کی دھاندلیاں کرتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا پہلے سے لین دین تھا ان میں سے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اگر اس سے کچھ لینا ہوتا تو تقاضے کر کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتے تھے اور اگر اسے کچھ دینا ہوتا تو اس کی رقم مار کھاتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ جب ہم نے تم سے معاملہ

کیا تھا اس وقت تمہارا دین کچھ اور تھا۔ اب چونکہ تم نے اپنا دین بدل دیا ہے اس لیے ہم پر تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ اس کی متعدد مثالیں تفسیر طبری، تفسیر نیسابوری، تفسیر طبرسی اور تفسیر روح المعانی میں سورہ آل عمران آیت ۷۵ کی تشریح کرتے ہوئے نقل کی گئی ہیں۔

چند واقعاتی شواہد

معاہدے کے خلاف یہ کھلی کھلی معاندانہ روش تو جنگ بدر سے پہلے ہی وہ اختیار کر چکے تھے، مگر جب بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اٹھے اور ان کے بغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے فتح اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینہ میں یہ افواہیں اڑانی شروع کر دی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی ہے اور اب ابوجہل کی قیادت میں قریش کا لشکر مدینے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ لیکن جب نتیجہ ان کی امیدوں اور تمناؤں کے خلاف نکلا تو وہ غم اور غصے کے مارے پھٹ پڑے۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چیخ اٹھا کہ "خدا کی قسم اگر محمد نے ان اشراف عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔" پھر وہ مکہ پہنچا اور بدر میں جو سرداران قریش مارے گئے تھے ان کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکہ والوں کو انتقام پر اکسایا۔ پھر مدینہ آ کر اس نے اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفاء کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہار عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول ۳ھ میں محمد بن مسلمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔ (ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ طبری)

یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگ بدر کے بعد کھلم کھلا معاہدہ توڑ دیا بنی قینقاع تھا۔ یہ لوگ خود شہر مدینہ کے اندر ایک محلہ میں آباد تھے، اور چونکہ یہ سنار، لوہار اور ظروف ساز تھے اس لیے ان کے بازار میں اہل مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردان جنگی ان کے اندر موجود تھے اور ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلہ خزرج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی ان کا پشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انھوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والے مسلمانوں کو ستانا اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ان کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو

بر سر بازار برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلہ میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر کے آپ نے ان کو راہ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ مگر انھوں نے جواب دیا "اے محمد! تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے، وہ لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم نے انھیں مار لیا۔ ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔" یہ گویا صاف صاف اعلان جنگ تھا۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال (اور بروایت بعض ذی القعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا۔ صرف پندرہ روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے تمام قابل جنگ آدمی باندھ لیے گئے۔ اب عبداللہ بن اُبی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپ انھیں معاف کر دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کی درخواست قبول کر کے یہ فیصلہ فرما دیا کہ بنی قَینُقَاع اپنا سب مال، اسلحہ اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینہ سے نکل جائیں۔ (ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ طبری) (۱۷۵)

باب ۹

یہودِ مدینہ کے مُفسدانہ رویّے کی چند واقعاتی تفاصیل

فصل ۱۰

یہود اپنے کیفرِ کردار تک کیسے پہنچے

کعب بن اشرف کا قتل

یہ شخص یہود بنی نضیر میں سے تھا اور اپنی قوم کے ساتھ اس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کے درمیان ہوا تھا مگر اسے اسلام اور خاص کر داعیٔ اسلام سے سخت عداوت تھی۔ وہ آپ کی شان میں ہجویہ اشعار کہتا، مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ اشعار کہتا اور کفار قریش کو آنحضرت کے خلاف اشتعال دلاتا تھا۔ جب جنگِ بدر میں آنحضرت کو فتح ہوئی تو اس کو سخت رنج ہوا اور وہ شدتِ غضب سے پکار اٹھا کہ،

واللہ لئن کان محمد اصاب ہولاء القوم لبطن الارض خیر لنا من ظہرہا۔

ترجمہ: "خدا کی قسم اگر محمدؐ نے قریش کو واقعی شکست دے دی ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔"

پھر وہ مدینہ سے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت دردانگیز طریقہ سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر ان کے عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔ اس کی یہ سب حرکات اس معاہدہ کے خلاف تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اور جس میں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا تاہم انھیں کسی نہ کسی طرح معاف

۱؎ عہدِ رسالت کا ایک واقعہ جس پر سخت اعتراضات کیے جاتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرا دیا۔ مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی جاہلیت کا "فتک" تھا اور بزدلی کے علاوہ آدابِ جنگ کے بھی خلاف تھا لیکن اس واقعہ کے چند مخصوص اسباب ہیں جن کو معترضین نے نظرانداز کر دیا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ان سب سے گزر کر وہ اپنے جذبۂ عناد میں یہاں تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک سازش کی تیاری کی جس کا مقصد آپ کو دھوکے سے قتل کرنا تھا۔ علامہ ابن اثیر نے ابومالک کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنحضرتؐ کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے قتل کرا دے[1]۔ چنانچہ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ،

إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (المائدہ۔ آیت ۱۱)

ترجمہ: "جب کہ ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اُٹھنے سے روک دیے۔"

ابن حجرؒ بھی اس روایت کو فتح الباری میں لائے ہیں مگر جس طریق سے انہوں نے اسے لیا ہے وہ ضعیف ہے تاہم ابوداؤد نے جو ایک بڑا مؤرخ ہے بنونضیر کا حال بیان کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

ارادوا بہ مکر برسول اللہ

ترجمہ: "انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔"

ان تمام بیانات سے اصل واقعہ کی صداقت مسلّم ہو جاتی ہے کہ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازشِ قتل نے مکمل کر دیا ہے اور اس کے بعد اس کے گردن زدنی ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک شخص معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے، اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے۔ ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلانِ جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا۔ خود اس کی قوم سے بھی یہ امید کم ہی تھی کہ وہ اس کو ان حرکات سے روکے گی کیونکہ ساری قوم کا رویہ اس کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ دوسرے اعدائے اسلام کے ساتھ بھی مل کر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر ہی سازشیں کرتا رہا۔ اس لیے اس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ

---

[1] ابن الاثیر ج ۲ ص ۳۰۔ فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۶ میں ہے کہ وَتَشَبَّبَ بِنِسَاءِ الْمُسْلِمِیْنَ حَتّٰی اٰذَاھُمْ

[2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب کیف کان اخراج الیہود میں ہے وَیُحَرِّضُ عَلَیْهِ کُفَّارَ قُرَیْشٍ۔

کر دیا جانا چاہیے تھا۔ آنحضرتؐ نے مجبوراً اسی آخری تدبیر کو اختیار کیا اور محمد بن مسلمہ کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔[1] (۱۶۱)

ابو رافع کے قتل کا واقعہ

ابو رافع کے متعلق صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کان ابو رافع یؤذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویعین علیہ "ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچاتا تھا اور آپ کے خلاف دشمنوں کی اعانت کرتا تھا" (کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع) لیکن ابن عائذ نے عروہ کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کان ممن اعان غطفان وغیرھم من مشرکی العرب بالمال الکثیر۔ "اس نے غطفان وغیرہ مشرکین عرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ میں بہت روپیہ سے مدد دی تھی" (فتح الباری ج ۷ ص ۲۴۳) طبری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کان حزب الاحزاب علی رسول اللہ۔ "اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگِ احزاب میں فوجیں اکٹھی کی تھیں" (ج ۳ ص ۰) ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ قد اجلب فی غطفان ومن حولہ من مشرکی العرب وجعل لھم الجعل العظیم لحرب رسول اللہ۔ "اس نے غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی ایک بہت بڑی جمعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے اکٹھی کی تھی" (ج ۲ ص ۶۶) ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کان یظاھر کعب بن اشرف علی رسول اللہ۔ "وہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ کے خلاف مدد دیتا تھا" (ج ۲ ص ۱۴۳ طبع یورپ) ان تمام بیانات کے ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی کعب کی طرح کبھی کھلے میدان میں لڑنے نہیں آیا اور پردے کے پیچھے سے دشمنوں کو مال اور فوجوں سے مدد دے کر رسول اللہؐ کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ (۱۶۲)

جنگِ اُحد کے موقع پر غداری

حضورؐ کے دو سخت اقدامات (یعنی بنی قینقاع کے اخراج اور کعب بن اشرف کے قتل) سے ایک مدت

---

[1] اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقے سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرا دینا اسلام کے قانونِ جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آنحضرتؐ سب سے پہلے ابوجہل اور ابوسفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے اور صحابہؓ میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتے تھے لیکن عہدِ رسالتؐ و عہدِ صحابہؓ کی پوری تاریخ میں ہم کو کعب بن اشرف اور ابو رافع کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اس طرح خفیہ طریقے سے قتل کیا گیا ہو، حالانکہ آپ کے دشمن صرف یہی دو شخص نہ تھے۔ پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقے سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے، بلکہ ایسے مخصوص حالات

تک یہودی اتنے خوف زدہ رہے کہ انھیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اس کے بعد شوال ۳ھ میں جب قریش کے لوگ جنگ بدر کا بدلہ لینے کے لیے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر چڑھ آئے اور ان یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کے لیے نکلے ہیں اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں، تو انھوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اس طرح کی کہ مدینہ کی مدافعت میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوئے، حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکۂ اُحد میں مسلمانوں کو نقصان عظیم پہنچا تو ان کی جرأتیں اور بڑھ گئیں، یہاں تک کہ بنی نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے لیے باقاعدہ ایک سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہو گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بئر معونہ کے سانحہ (صفر ۴ھ) کے بعد عمرو بن اُمیہ ضمری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غلطی سے بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا جو دراصل ایک معاہد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس غلطی کا خون بہا مسلمانوں پر واجب الادا ہو گیا تھا، اور چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدے میں بنی نضیر بھی شریک تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ساتھ خود ان کی بستی میں تشریف لے گئے تاکہ خون بہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔

حضورؐ کے قتل کی سازش

وہاں اُنھوں نے آپ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اس مکان کی چھت پر سے آپؐ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرا دے جس کی دیوار کے سائے میں آپ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بروقت خبردار کر دیا اور آپ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

بنو نضیر کو حضورؐ کی طرف سے الٹی میٹم

اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔ حضورؐ نے ان کو بلا تاخیر الٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آ گئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جاؤ، اس کے بعد اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو جو شخص بھی تمہاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن مار دی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن اُبَی نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا اور بنی قریظہ اور بنی غطفان بھی تمہاری

میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آتا ہو اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو۔

مدد کو آئیں گے تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔

حضورؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں مقابلہ کا اعلان

اس جھوٹے بھروسے پر انھوں نے حضورؐ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ اس پر ربیع الاول ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا اور صرف چند روز کے محاصرے کے بعد (جس کی مدت بعض روایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آئی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے پر راضی ہو گئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے لے جائیں گے۔ اس طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرا لی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھہر گئے۔ باقی شام اور مصر کی طرف نکل گئے۔ (۱۴۹)

مخالفین اسلام کا اعتراض اور اس کا جواب

بنی نضیر یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا۔ ہجرت کے بعد آنحضرتؐ کا ان سے معاہدہ ہوا، اور جنگ احد کے بعد آپ نے ان کو مدینہ سے نکال دیا۔ مخالفین اس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بنی نضیر کے ساتھ نعوذ باللہ مکر کیا یعنی جب کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا اور جب طاقتور ہو گئے تو معاہدہ توڑ کر انھیں جلا وطن کر دیا لیکن یہ واقعہ کی محض ایک سادہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے ورنہ اگر اس کی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورت واقعہ بالکل برعکس نظر آئے گی۔ عہد شکنی کے مجرم رسول اللہؐ نہیں بلکہ خود بنی نضیر نکلیں گے اور ان کے خلاف آنحضرتؐ کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق ثابت ہو گی۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنو نضیر سے بھی ایک معاہدہ[1] کیا تھا جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہ کریں گے نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی امداد کریں گے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ:

وادعهم على ان لا يحاربوه ولا يمالئوا عليه عدوه[2]

ترجمہ: "ان سے مصالحت کی تھی اس بات پر کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے"۔

اس معاہدہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے اور ان

---

[1] ابن ہشام نے سیرت میں اس معاہدہ کو بتفصیل نقل کیا ہے۔ (از مؤلف)

[2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۱

سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا۔ لیکن شرائط معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفار قریش سے ساز باز کرتے رہے اور چپکے چپکے ان کو مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے۔ موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے۔

کانت نضیر قد دسّوا الی قریش و حضّوهم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و دلّوهم علی العورة۔ لہ

ترجمہ: "بنی نضیر قریش سے سازشیں کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر ابھارتے اور انھیں خفیہ خبریں دیتے تھے۔"

پھر انھوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی۔ ایک مرتبہ آپؐ کو کہلا کر بھیجا کہ آپؐ اپنے ساتھ تین آدمی لے کر آجیے اور ہم بھی اپنے تین عالم بھیجتے ہیں، ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کی بحث ہو اور اگر آپؐ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دعوت کو منظور کر لیا۔ مگر ابھی جلسے کی جانب روانہ نہ ہوئے تھے کہ خود بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا، یہ اطلاع دی کہ یہودی خنجر لے کر آ رہے ہیں اور تمھارا حضورؐ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لہ

ایک دوسرے موقع پر آنحضرتؐ بنی عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لیے بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر دوستانہ برتاؤ کیا اور آپ سے کہا کہ ہم مدد دینے کو حاضر ہیں، مگر آپس میں جاکر مشورہ کیا کہ "یہ شخص تم کو ایسی حالت میں پھر نہ ملے گا، بہتر یہ ہے کہ ہم میں کا ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھے اور اس پر ایک بھاری پتھر پھینک دے۔" چنانچہ یہ بات طے ہو گئی اور اس کام کے لیے عمرو بن جحاش بن کعب مقرر کیا گیا۔ مگر عین وقت پر آپؐ کو اطلاع ہو گئی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ لہ

ایسے حالات میں صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طریقہ سے آنحضرتؐ کو شہید نہ کر دیں۔ مسلمان ان سے ایسے خوف زدہ ہو گئے تھے

لہ فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲

لہ اس واقعہ کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ابوداؤد فی خبر النضیر اور فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۳ میں بیان کیا گیا ہے (ابن یوسف)

لہ طبری مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۳۷، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲، فتوح البلدان ص ۲۴

کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نہ دینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لیے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو قتل کر دے۔ ایسی حالت میں ان عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی، مگر آنحضرتؐ نے پھر بھی ان کے ساتھ رعایت کی اور دفعۃً ان پر حملہ کر دینے کے بجائے محمد بن مسلمہ کے ذریعہ سے ان کو یہ الٹی میٹم دیا کہ:

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے، لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دو، ورنہ میں مجبوراً تم سے جنگ کروں گا۔"

دوسری طرف عبداللہ بن اُبی سردار منافقین نے انھیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمہاری مدد کریں گے چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے الٹی میٹم کا جواب یہ دیا کہ:

"انا لا نخرج من دارنا فاصنع ما بدالک"

ترجمہ: "ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔"

اس کارروائی پر کیسے اعتراض کیا جا سکتا ہے

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب نہ تھے، آپ نے اتمام حجت کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جا سکتی تھی وہ بھی کر چکے تھے۔ اب مجبوراً جنگ کے لیے نکلے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ قبل اس کے کہ خونریزی کی نوبت آتی صرف محاصرہ ہی کی شدت نے بنی نضیر کو بدحواس کر دیا۔ انھوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں ہم مدینہ سے نکل کر اذرعات (شام) کو چلے جائیں گے، اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ لے جائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس شرط کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور کر لیا اور بغیر کسی ادنیٰ ضرر کے بنو نضیر اسلامی علاقہ سے گزر کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس مصالحت کے متعلق

---

۱ اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۰، ذکر طلحہ بن براء،

۲ طبری ج ۳ ص ۳۸، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۳، فتوح البلدان ص ۲۴

۳ طبری ج ۳ ص ۳۸

بلاذری لکھتا ہے :

ثم صالحوه على ان يخرجوا من بلده ولهم ما حملت الابل الا الحلقة والآلة[1]

ترجمہ : پھر انھوں نے اس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپ کے شہر سے نکل جائیں گے اور سوائے اسلحہ اور زرہوں کے باقی جو مال ان کے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ ان کا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے :

فسئلوا ان يجلوا عن ارضهم على ان لهم ما حملت الابل فصولحوا على ذلك[2]

ترجمہ : پھر انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے اور جو کچھ ہمارے اونٹ اٹھا سکیں وہ ہمارا ہو۔ چنانچہ اسی پر ان کی صلح ہو گئی۔

یہ ظاہر ہے کہ اعلانِ جنگ ہونے کے بعد ایسی حالت میں جبکہ ان کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر کے پورا پورا انتقام لیا جا سکتا تھا، ان کی شرائط مان لینا اور ان کو امن و سلامتی کے ساتھ صرف اپنی جانیں ہی نہیں بلکہ اپنا مال بھی لے کر نکل جانے دینا بجز رحم دلی اور صلح پسندی کے اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہی شخص ایسا کر سکتا ہے جس کا مقصد خونریزی و غارت گری نہ ہو بلکہ محض دفع شر ہو۔ مگر اس احسان کا جو بدلہ آنحضرتؐ کو ملا وہ بہت ہی تلخ تھا۔ جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آ جانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا انھوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا، اور دو ہی سال بعد وہ ۲۴ ہزار کا لشکر جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے[3]۔ اگر آپ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا۔ لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی کہ کسی مغلوب دشمن کی التجائے رحم کو رد کر دیتے۔ آپ کو ان کے جذبۂ عناد کا حال خوب معلوم تھا، اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز جس سے نہ بیٹھیں گے مگر اس کے باوجود جب انھوں نے جان بخشی کی درخواست کی تو آپ نے اسے قبول کر لیا۔ (۱۸)

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۲

[2] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲

[3] اس سے مراد جنگ احزاب (یا جنگ خندق) ہے جس میں یہودیوں کے ساتھ مشرکین مکہ اور دوسرے مشرک قبائل بھی شریک تھے (مؤلف)

فصل ۲

غزوۂ خندق کے وقت بنو قریظہ کی بدعہدی

غزوۂ بنی قریظہ ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ خندق کے معرکے میں جب کفار کو منہ کی کھانی پڑی، کیونکہ کفارِ عرب اس طریقِ دفاع، یعنی خندق کھود کر مدافعت کرنے سے ناآشنا تھے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا، تو ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس لیے یہود و کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں جو مدینہ طیبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قریظہ کی جانب تھیں اور اُدھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ ان کی طرف سے بنی نضیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطَب بنی قریظہ کے پاس بھیجا گیا تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن جب ابن اَخطَب نے ان سے کہا کہ "دیکھو، میں اس وقت عرب کی متحدہ طاقت اس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا" تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

حضورؐ کو بروقت اطلاع مل گئی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپ نے فوراً انصار کے سرداروں (سعد بن عُبادہ، سعد بن مُعاذ، عبداللہ بن رَواحہ اور خَوات بن جُبیر) کو ان کے پاس تحقیق حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُرَیظہ عہد پر قائم رہیں تو آکر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان یہ خبر سُنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مُصر ہوں تو صرف مجھ کو اشارۃً اس کی اطلاع دے دینا تاکہ عام مسلمان یہ بات سُن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قُرَیظہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لا عقد بیننا و بین محمد۔ ولا عہد

"ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔"

اس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارۃً حضورؐ سے عرض کر دیا "عَضَل و قارہ" یعنی قبیلہ عَضَل اور قارہ نے رجیع کے مقام پر مبلغینِ اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قریظہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا، کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آگئے تھے اور شہر کا وہ حصہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ "ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے مُلک فتح ہو جانے کے کیے جاتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔" کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، ہمیں جا کر ان کی حفاظت کرنی ہے۔" کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ درست کر لو اور محمدؐ کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

بنی غطفان سے صلح کی تجویز اور اس کا ترک

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر

آمادہ کرنا چاہا کہ مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا ⅓ حصہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعد بن عُبادہ اور سعد بن مُعاذ) سے آپ نے ان شرائط صلح کے متعلق مشورہ طلب فرمایا تو انھوں نے عرض کی "یارسول اللہ، یہ آپ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں، یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، یا آپ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرما رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا "میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پل پڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں ایک دوسرے سے توڑ دوں۔" اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ "اگر آپ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے اُس وقت بھی ہم سے ایک حبہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔" یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مسودے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

نعیمؓ بن مسعود کا کارنامہ

اسی دوران میں قبیلۂ غطفان کی شاخ اشجع کے ایک صاحب نُعیمؓ بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے۔ آپ اس وقت مجھ سے جو خدمت لینا چاہیں میں اسے انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔" چنانچہ وہ پہلے بنی قریظہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا اور ان سے کہا کہ قریش اور بنی غطفان محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ مگر تمھیں اسی جگہ رہنا ہے۔ وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمھارا کیا بنے گا؟ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت جنگ میں حصہ نہ لو جب تک ان باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قریظہ کے دل میں اُتر گئی۔ انھوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر آدمی مانگیں اور انھیں محمد (صلی اللہ علیہ

؎ اسی موقع پر آپ نے فرمایا تھا اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

دشمن کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ان کے ساتھ ذرا ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنی قریظہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ "اس طویل محاصرے سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے۔ کل تم ادھر سے حملہ کرو، ہم ادھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔" بنی قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کریں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین ہو گیا کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس سے بنی قریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔ (۱۸۱)

فصل ۳

بنو قریظہ پر چڑھائی اور محاصرہ

خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبرئیلؑ نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، ابھی بنی قریظہ کا معاملہ باقی ہے۔ اُن سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔" اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرم عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔

حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

بنو قریظہ کی طرف سے صلح کی درخواست

محاصرہ کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس اُمید پر حکم بنایا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدتوں سے چلے آ رہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینہ سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قینقاع اور بنی نضیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلہ اوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں

کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر[1] چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہل مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔

بنو قریظہ کے مقرر کردہ ثالث کا فیصلہ

اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اسی فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جبکہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔ (۱۸۲)

---

[1] مختلف روایتوں میں غزوۂ احزاب کے موقع پر حملہ آور ہونے والے لشکر کی تعداد مختلف بیان ہوئی ہے۔ (مولف)

فصل ۴

مخالفین کے اعتراضات اور ان کا جواب

مخالفین اسلام نے بنو قریظہ کے اس واقعہ کو سخت اعتراضات کا ہدف بنایا ہے۔ یہ لوگ بھی ان یہودی قبائل میں سے تھے جن سے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہوا تھا۔ پھر جب بنو نضیر سے جنگ ہوئی تو آپ نے دوبارہ ان کو معاہدہ کی دعوت دی اور قدیم معاہدہ کی تجدید کر لی۔[1] مگر جب جنگ احزاب میں انھوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپ نے اُدھر سے فارغ ہو کر ان پر حملہ کیا۔ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا، بچوں اور عورتوں کو یرغمال بنا لیا اور ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس واقعہ کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بدعہدی اور شقاوت و سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں، مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی جائے تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی قریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا۔ ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا، دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے لڑائی کے موقع پر ان سے کیا گیا۔ ان دو معاہدات کے بعد بنو قریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کاروائی میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن جنگ احزاب میں جب بنو نضیر کی تحریک پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لیے متفق ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، تو بنو قریظہ نے حُیَیّ بن اخطب نضری کے بھڑکانے سے علانیہ معاہدہ توڑ دیا اور جنگ میں شامل ہو گئے۔[2] آنحضرت نے جب ان کے نقض عہد کی خبر ہوئی تو آپ نے سعدؓ بن مُعاذ اور سعد بن عُبادہؓ کو ان کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی، مگر انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا تمھارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والفئ والامارہ، باب فی خبر النضیر

[2] ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۷۴، فتح الباری ج ۷، ص ۳۰۰

ان کے اس طرح عین وقت پر عہد توڑ دینے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ دو طرف سے محصور ہو گیا، ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی فوجیں تھیں، دوسری طرف بنو قریظہ کی۔ سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لیے بھیج دیا تھا وہ بنو قریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اس کا محاصرہ کر لینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو وحشت اور پریشانی میں مبتلا کر دیا حتیٰ کہ آنحضرت ؐ نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دے کر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں [1]

قرآن مجید میں اس پریشانی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا۔ (احزاب۔ آیت ۱۰)

ترجمہ: "جب کہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائیں شہر کی جانب سے چڑھ آئے اور جب دیدے پھرنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں۔

"اس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک طرف ابوسفیان اور اس کے ساتھی زبردست فوجیں لیے ہوئے اوپر سے آئے اور دوسری طرف بنی قریظہ نیچے سے بڑھے اور ان کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ گئی" [2]

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خودکشی کرنا تھا۔ چنانچہ جب احزاب کے دل بادل چھٹ گئے اور بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا تو آنحضرت ؐ نے فوراً بنی قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۱۵ دن یا ۲۵ دن تک اسلامی فوجیں ان کے قلعہ کے گرد پڑی رہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا تو آنحضرت ؐ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ سعدؓ بن معاذ ہمارے حق میں جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہے [3]۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انھوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا تھا۔

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۸۰، فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱

[2] فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱، ابن کثیر ج ۸ ص ۵۲ (از مؤلف)

[3] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب جواز قتال من نقض العہد، فتوح البلدان ص ۲۹

آپ نے انہی یہودیوں سے سعد بن معاذؓ کو حکم بنایا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، ان پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے حق میں نا واجب فیصلہ کریں گے[1]۔ بہر حال جو صورت بھی ہو سعدؓ بالاتفاق حکم بنائے گئے اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے مرد قتل کر دیے گئے۔

اب جہاں تک بد عہدی کے الزام کا تعلق ہے وہ تو صاف ہو چکا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرتؐ نے ان پر حملہ کر کے عہد شکنی کی ہے۔ مگر دوسرا الزام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے ساتھ انتقام بہت سخت لیا گیا۔ مگر اس کو سختی اور سنگ دلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

۱۔ بنو قریظہ اور ان کے ہم قوم بنو نضیر کی بد عہدیوں کو دیکھ کر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سر نو کوئی معاہدہ کیا جاتا اور یہ توقع قائم کی جا سکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑ دیں گے۔

ان کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے اور اس صریح غداری کے بعد ان جنگ آزما قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

۳۔ ان کو جلا وطن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنو نضیر کو جلا وطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینہ پر چڑھا لائے۔

۴۔ ان باتوں کے باوجود آنحضرتؐ نے خود ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ ان کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا پرانا حلیف تھا۔

۵۔ ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی شخص حکم، ثالث یا پنچ بنایا جائے تو جو فیصلہ وہ کر دے اس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے۔

۶۔ سعدؓ بن معاذ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ تورات کے احکام کے مطابق تھا[2]، اس لیے کسی یہودی نے اس

---

[1] زمانہ جاہلیت میں حضرت سعدؓ کے قبیلے اور بنی قریظہ کے درمیان حلف کا تعلق تھا اور قدیم عرب میں حلف کا تعلق خونی رشتوں سے کچھ کم مضبوط نہ ہوتا تھا۔

[2] جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازے تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جاتی ہے تیری باجگزار ہوگی اور [illegible]

کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

۷۔ ان میں سے صرف وہ مرد قتل کیے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے۔ کیونکہ انھیں سے جنگ و غدر کا اندیشہ تھا۔ باقی رہیں عورتیں اور بچے تو ان کے سر دھروں کے قتل ہو جانے کے بعد ان کی پرورش کا بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے۔

ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنو قریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ عین انصاف کے مطابق تھا، اور اس کے سوا ان سے کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (۱۸۳)

اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔ مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لیے غنیمت کے طور پر لے لے۔"
(استثنا۔ باب ۲۰۔ آیت ۱۰-۱۴)

فصل ۱۵

عرب میں یہود کا زور ٹوٹ گیا

سورۂ جمعہ کا پہلا رکوع اس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے انھوں نے کیں۔ پہلے مدینہ میں ان کے تین طاقتور قبیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے، اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پوری طرح تباہ ہو گیا اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے مگر غزوۂ احزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڑھ خیبر رہ گیا تھا جہاں مدینے سے نکلے ہوئے یہودیوں کی بھی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ اس رکوع کے نزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی توقع کے فتح ہو گیا اور یہودیوں نے خود درخواست کر کے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیا۔ اس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار جس کا نام سننا تک انھیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو سورۂ جمعہ میں ایک مرتبہ پھر خطاب فرمایا، اور یہ غالباً آخری خطاب تھا جو قرآن مجید میں ان سے کیا گیا۔ اس میں انھیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔

۱۔ تم نے اس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ "اُمّی" کہتے ہو۔ تمھارا زعمِ باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمھاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمھاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے کیونکہ یہ منصب تمھاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور "اُمّیوں" میں کبھی کوئی رسول نہیں آ سکتا لیکن اللہ نے انھی اُمّیوں میں سے ایک رسول اٹھایا ہے جو تمھاری آنکھوں کے سامنے اس کی کتاب سنا رہا ہے، تعلیم

کا تزکیہ کر رہا ہے اور ان لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔ اس کے فضل پر تمہارا اجارہ نہیں ہے کہ جسے تم دلوانا چاہو اسی کو وہ دے اور جسے تم محروم رکھنا چاہو اسے وہ محروم رکھے۔

۲۔ تم کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی نہ ادا کی۔ تمہارا حال اس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اسے کچھ نہ معلوم ہو کہ وہ کس چیز کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔ بلکہ تمہاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا مگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو، اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے اور اس پر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔ گویا تمہاری رائے یہ ہے کہ خواہ تم اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو، بہرحال اللہ اس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمہارے سوا کسی کو نہ بنائے۔

۳۔ تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمہیں اگر یقین ہوتا کہ اس کے ہاں تمہارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمہیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو۔ تمہاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو اور تمہارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مرے تو اللہ کے ہاں اس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔

فصل ۶

یہودِ خیبر کا اخراج
(خلافتِ راشدہ میں)

عہدِ رسالت علیٰ صاحبہا السلام کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصّہ پر معاملہ کر لیا تھا اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انہیں جلا وطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اس طرح انھوں نے عہد شکنی اور اہلِ الذمّہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بظاہر بہت معقول ہے۔ مگر تاریخ نے وہ تمام حقائق محفوظ رکھے ہیں جن سے اس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

حضورؐ سے یہودِ خیبر کی شرائط

خیبر جب فتح ہوا تھا تو ابتداً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی کہ آپؐ ان کی جان بخشی کر دیں گے اور وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔[1] لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بند و بست کا موقع آیا تو اہلِ خیبر نے آپؐ سے درخواست کی کہ:

"آپ ہم کو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں، کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی اور ان سے عارضی طور پر معاملہ کر لیا۔ لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کر دی کہ اقرکم ما اقرکم اللہ میں تم کو برقرار رکھوں گا جب تک اللہ تم کو برقرار رکھے گا۔[2] اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو مستقل طور پر نہیں رکھا جائے گا بلکہ

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۹-۳۰، ابن ہشام ص ۷۷۹، ابن سعد ج ۲ ص ۸۰-۷۹

[2] بخاری کتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعۃ۔ فتوح البلدان ص ۲۹

جب تک احکام خداوندی کے مطابق ہمارے قومی صالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں گے اس وقت تک تمہیں رہنے دیا جائے گا، اور جب تمہارا طرزِ عمل نامناسب ہوگا تو ہمیں آزادی ہوگی کہ اصل صلح نامہ کی شرائط کو نافذ کر کے تمہیں جلاوطن کر دیں۔ ابن حجرؒ نے اس جملہ کی یہ تشریح کی ہے۔

وان المراد بقوله ما اقرکم الله ما قدر الله ان نترککم فیھا فاذا شئنا فاخرجناکم لتبین ان الله قدر اخراجکم[1]

ترجمہ: یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تک اللہ تم کو رکھے گا" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اللہ نے تمہارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تم کو رہنے دیں گے، اور جب ہم تمہیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے تو یہ فعل خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ تمہارے اخراج کے لیے اللہ کی تقدیر پوری ہو چکی ہے۔"

ابوداؤد نے ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ تصریح کی ہے:

کان عامل خیبر علی ان نخرجھم اذا شئنا[2]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے ان کو نکال دیں گے۔"

اس سے یہ بات قطعاً بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کے لحاظ سے ان کے اخراج کو بدعہدی کہا جا سکتا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ ان کے اخراج ہی کا مقتضی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاہدہ ان سے کیا گیا تھا اسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لیے ذیل کے واقعات پیشِ نظر رکھنے چاہییں۔

طے شدہ شرائط سے یہود کا انحراف

صلح کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ان میں سے ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور اس میں آپؐ کو زہر کھلا دیا۔ بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرمہ نے اعترافِ جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی[3]

---

[1] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷
[2] ابوداؤد، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر
[3] صحیح بخاری میں یہ واقعہ کئی جگہ مذکور ہے، غزوہ خیبر کے بیان اور کتاب الطب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں انھوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے پر ڈال دیا۔[۱]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسر بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔[۲]

حضرت عمرؓ کے دور میں یہود خیبر کے اخراج کی کاروائی

ابتدائی واقعات تو خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس لیے عامۃ الناس کو اس جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا۔ مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا اور تمام قوم کا معاندانہ رویہ ظاہر نظر آ رہا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو صحابہ کی مجلس میں پیش کیا اور اس بات پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان عامل یہود خیبر علی اموالہم وقال نقرکم ما اقرکم اللہ وان عبد اللہ ابن عمر خرج الی مالہ ہناک فعدی علیہ من اللیل ففدعت یداہ ورجلاہ ولیس لنا ہناک عدو غیرہم ہم عدونا وتہمتنا وقد رأیت اجلاءہم۔[۳]

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود خیبر سے ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ "ہم تمھیں برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تم کو برقرار رکھے گا"۔ اب عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے، رات کے وقت ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے گئے۔ اس وقت اس ملک میں ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں اس لیے میری رائے میں ان کو جلاوطن کر دینا چاہیے۔"

حضرت عمرؓ کی اس تجویز سے تمام مجلس نے اتفاق کیا اور یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو بھی اس طرح جلاوطن نہیں کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انھیں یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ کر گئے اس کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا۔ سفر کی آسانی کے لیے اونٹ اور کجاوے دیے گئے یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا

---

۱ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۵

۲ فتوح البلدان صفحہ ۴۱ - ابن ہشام ص ...

۳ بخاری کتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعۃ

کی تحقیق کی

اس معاملے کے متعلق ایک اہم حدیث

اس میں شک نہیں کہ بعض روایات میں ان کے اخراج کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی کہ لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب ؛ "جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں"[1] تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہو جانے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا۔ بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب زہری کے طریق سے نقل کیا ہے[2] ، اور امام زہری نے عبد اللہ بن عتبہ کے طریق سے[3] لیکن اس حدیث کا منشا یہ ہرگز نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلا قصور عرب سے نکال دیا جائے۔ امام زہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اعلان کرایا کہ ،

من کان لہ من اھل الکتابین عھد فلیات بہ ، انفذہ لہ[4]

ترجمہ : "دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اسے نافذ کروں"۔

ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کا منشا یہ ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیئے جائیں تو حضرت عمرؓ یہ اعلان ہرگز نہ کراتے بلکہ تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کر دیتے خواہ ان سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہلِ معاہدہ سے ان کے عہد نامے طلب کیے اور وعدہ کیا کہ ان عہد ناموں کو نافذ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے مطلقاً اخراج مقصود نہ تھا بلکہ ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی جس پر دوسرے واجبات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہیے تھا۔ پس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع مرغوب نہ تھا بلکہ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہودِ خیبر کی مسلسل بدعنوانیوں

---

[1] بخاری کتاب الشروط

[2] فتوح البلدان ص ۳۴

[3] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷

[4] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷

سے تنگ آ کر حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو لازمی طور پر انھیں ایک ذمّی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامل ہوا ہوگا اور وہ کسی شرعی حجت کی تلاش میں ہوں گے، اسی دوران میں یہ حدیث ان کو پہنچی ہوگی اور اس کی اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہو کر انھوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ بعد میں راویوں نے اپنے اپنے رجحانِ طبع کے موافق اس ایک واقعہ کے دو الگ واقعے بنا لیے اور دو مختلف روایتوں کی صورت میں بیان کرنے لگے۔ (۱۸۵)

باب ۱۰

موجودہ دور میں یہودی ریاست کا قیام

اور اُس کی مُسلم دُشمن کاروائیاں

فصل ۱۰

یہودی ریاست کے قیام کا پس منظر

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (RED INDIANS) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہیکل سلیمانی (TEMPLE OF SOLOMON) کو جسے دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوندِ خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا دور بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ سنہ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر

اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا۔ اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا۔ بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے ممنوع کر رکھا تھا اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

۱۔ یہودی ابتداءً نسل کشی (GENOCIDE) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲۔ شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک آباد رہے۔

۳۔ جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ سو برس رہی۔

۴۔ اور عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انھیں عطا فرمائی ہے اور انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو زورِ عمل حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انھوں نے کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈرامہ کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جاتی رہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (MAIMONIDES) نے اپنی کتاب قانون یہود (THE CODE OF JEWISH LAW) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو ازسرِنو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (FREE MASON MOVEMENT) بھی جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات

میں ترتیب دیئے ہوئے یہ حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کریں، اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اسی لیے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم و ستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوار گریہ جس کو آج یہودی اپنے مذہب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن NEWS FROM ISRAEL شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوار گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ مسلمانوں

کی شرافت اور فیاضی اور حسن سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں چنانچہ ۱۸۸۲ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل (HARTZL) نے ۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک (ZIONIST MOVEMENT) کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی) کو باقاعدہ یہ پیغام بھیجا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ "جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں۔" جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام قرہ صو آفندی تھا۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ پیش کر دے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا بڑا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں جن میں فری میسن، دونمہ[1] اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں

[1] یہ وہ یہودی تھے جنھوں نے ریاکارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں۔

پختہ ہو گیا اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر ان کے پاس گئے تھے ان میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صو آفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات برس پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہو گی جب یہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

فصل ۲

بین الاقوامی صورتِ حال

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنا اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کُرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے۔ بیروت اس کا مرکز تھا اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور

پہلی جنگِ عظیم میں ابتداءً یہودیوں نے حکومتِ جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی یہ قرین

کو یقین نہیں آتا تھا کہ چیم ویلیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی بھاری قوت و قابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے اگر آپ ہم کو یہ یقین دلادیں کہ آپ فتح یاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بد دیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خود مختار ریاست بنا دیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریز قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔ پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آرہی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پورے ۵ فیصد بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنت برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا جو دنیا بھر میں ۱۹ سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمھیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اسی سے تم انہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اسی خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے:

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے اُن سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں۔"

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (DOCUMENTS OF BRITISH POLICY) کی جلد سوم میں ثبت ہیں۔

مجلس اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں مجلس اقوام (LEAGUE OF NATION) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں، برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صیہونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے انتداب (MONDATE) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۱۴۶۴ اور یہودی ۸۲۷۹۰ تھے اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے۔[2] اس پر بھی مجلس اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے۔ صیہونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (CIVIL) حقوق کا تحفظ کیا جائے، سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تھا اس مجلس اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسائے جانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلس اقوام میں

---

[1] انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطور خود کسی ملک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلس اقوام کی طرف سے اس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

[2] ۱۹۱۸ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کیے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں اگر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں مزید برآں ان کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو آٹھ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس ۳ پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صہیونیت کی خدمت سرانجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صہیونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب

کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انھیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنانے کے بجائے ان کی "قومی ریاست" قائم کر دیں۔

فصل ۳

یہودیوں کا آئندہ لائحۂ عمل

"قومی وطن" سے "قومی ریاست" تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صیہونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اس کی جانشین اقوام متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن و انصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی، اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائبیریا کو ہموار کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے، اور جیمز فوریسٹال (FORRESTAL) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (SCANDAL) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔"

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فی صدی رقبہ، ۳۳ فی صدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فی صدی رقبہ، ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صدی یہودیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندربانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انھوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا

اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے، آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A STUDY OF HISTORY) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کے قتل عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ سپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ "ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمھارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔" ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رتی برابر بھی شرافت و انسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا، اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۶ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردوپیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے۔ اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیا سے آئے تھے جو آج خود ظلم و ستم کا شکار ہے۔ اقوام متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں روس

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس اور پورے باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحدِ شام کی بالائی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا اور ۱۲-۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکہ اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا ـــ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید و حمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۱۹۵۵ء تک علانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۵ء تک جب عرب ممالک اس سے بالکل مایوس ہوگئے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انھیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انھیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے دائرہ اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہو سکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن تک اور عراق سے الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہوگیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدت میں امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا۔ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس

کی پشت پناہی کرتے رہے اور انھی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کرسکی۔ نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک اقوام متحدہ کے ۲۸ ریزولیشن وہ اس کے منہ پر مار چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک ۲ مرتبہ اقوام متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ "اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی خلاف ووٹ دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہ نکلیں گے"۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھکرا رہا ہے اور اقوام متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکہ کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۱۹۶۷ء کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کاری جا ہوائی حملہ کردے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہوسکے اور انھوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس (HELMS) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کردی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کرکے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جاکر اسرائیل پر "وحی"[1] نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کردینے کا مناسب موقع آگیا ہے۔ اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لنڈن کے سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (THE HOLY WAR - JUNE 67)

---

[1] اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر "وحی" کیا کرتے تھے۔

اس کا جواب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے (BACK AFTER 896 YEARS) یعنی "۸۹۶ برس کے بعد واپسی" اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا۔ عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ "ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔"

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰ سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقامات مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جزء کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کر رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام کے شدید ردعمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ

ہے کہ ہیکل کی تعمیر تو مسیح ہی آکر کرے گا، جب تک وہ نہ آجائے ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ یہاں کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو شدت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوار گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی MESSIANIC ERA میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربی نے تورات ہاتھ میں لے کر اس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوار گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ "آج ہم ملتِ یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں۔" انہی دو وجوہ سے مسجد اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تا کہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جز اس منصوبے کا یہ ہے کہ "میراث کے ملک" پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے کا ارادہ خود اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سنیئے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکا، تو پھر خاکم بدہن ہمیں وہ

ؔ واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود (PROMISED MESSIAN) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال قرار دیا ہے۔

ؔ جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربی ہوتے ہیں۔ ان کے چیف ربی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈیر جنرل کا رینک حاصل ہے۔

دن بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں۔

پس چہ باید کرد؟

اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیشِ نظر مسئلے کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار رہی ہیں اور ان کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکہ کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقتیں اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصیٰ، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجدِ اقصیٰ کے سانحہ سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صیہونیت کی عظیم الاقوامی سازش کا مقابلہ، جبکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید و حمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں

ہے جو دنیا میں اگر ایک کروڑ ۴۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۵۰-۵۵ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں اور ان کی ۳۰-۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے ہیں اور لائے گئے ہیں انھیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے اور عالم اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ یہودیوں کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقامات مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے۔ جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور قومی ریاست بنانے کے لیے مسلط ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکہ، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو دنیا کے

زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبہ خیر سگالی باقی رہ جائے۔ اب خود وہ فیصلہ کرلے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔ (۱۷۹)

یہودیوں کا مسلمانوں کے ساتھ رویّہ

مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کردی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پاکر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے اور آج تک پائے جارہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے۔ اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آجانے کے بعد ان سے کیا برتاؤ کررہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویّہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویّہ ہے۔ (۱۸۰)

فصل ہم

خاتمۂ بحث

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (النساء۔ آیات ۱۶۰-۱۶۱)

ترجمہ: غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویّہ کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں، اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یعنی وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بیباک مجرم بن چکے ہیں کہ دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآنحالیکہ یہ کمبخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے اسے پروان چڑھایا۔ ان نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ چیز بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے موجد و مخترع اور بانی و سربراہ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔

اشتراکیت کے بعد زمانہ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا ستون فرائڈ کا فلسفہ ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔ (۱۸۸)

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور